عام پسند سلسلہ [11]

ہماری قومی زبان

ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو کے افکارِ عالیہ

اُردو زبان کے متعلق

انجمن ترقی اُردو (ہند) دہلی

سنہ ۱۹۴۱ء

قیمت آٹھ آنے

فہرست

رائٹ آنریبل سر تیج بہادر سپرو بالقابہ

صدر، انجمن ترقی اردو (ہند)

تعارف

از جناب ڈاکٹر مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری انجمن ترقی اُردو (ہند)

اس مہینے (۸ دسمبر سنہ ۱۹۴۱ء کو) رائٹ آنریبل سر تیج
بہادر سپرو نے اپنی عمر کی چھیاسٹھ منزلیں بخیر و خوبی طے
کیں۔ سر تیج بہادر سپرو نہایت بے تعصب، بے لاگ،
اور سچے مُحبِّ وطن ہیں۔ اس شور و شغب کے زمانے
میں بھی جبکہ ہمارے ملک کے بڑے بڑے رہنما جذبات
کی رَو میں کہیں کے کہیں نکل گئے تھے، اُن کے

قدم نہیں ڈگمگائے ۔ وہ نہ کبھی حکومت سے اختلاف
کرنے سے جھجکے اور نہ کبھی اپنے بزرگوں اور دوستوں
سے سچی بات کہنے میں چوکے ۔ وہ ہمیشہ اپنے اصول
پر قائم رہے اور اگرچہ اس کی پاداش میں انھیں اپنے
ہم وطنوں سے بہت کچھ بُرا بھلا سننا پڑا لیکن انھوں نے
کبھی اس کی پرواہ نہ کی اور اپنی آزادیٔ رائے کو ہاتھ
سے نہ دیا۔ اور بالآخر اُن کے اکثر مخالفوں کو بھی ان
کی اصابت رائے اور انصاف پسندی کا قائل ہونا پڑا۔

وہ نہایت عالی ظرف ، عالی خیال اور ہمدرد
بزرگ ہیں ۔ ان کے اخلاق کی طرح ان کی دوستی اور
محبت کا دائرہ بھی بہت وسیع ہے۔ ہندو مسلمان سب
سے یکساں محبت اور خوش اخلاقی سے پیش آتے ہیں

اور نہایت کشادہ دلی سے ان کے کاموں میں مدد دیتے ہیں۔

اُن کا مطالعہ بہت وسیع ہے اور برابر نئی نئی کتابیں پڑھتے رہتے ہیں۔ اُن کا کتب خانہ اُن کے ذوقِ ادب اور شوقِ علم کا شاہد ہے۔ اہل علم اور ادیبوں اور شاعروں کے بڑے قدر دان اور سرپرست ہیں۔ بیسیوں غریب طالب علم ان کی بدولت اپنی مُراد کو پہنچے اور فارغ التحصیل ہوئے۔

وہ اُردو زبان کے بہت بڑے حامی ہیں اس لیے کہ وہ اسے ہندستانی تہذیب کا بہت بڑا جز اور ہندو مسلمانوں کی متحدہ اور مشترکہ کوشش کا بڑا کارنامہ سمجھتے ہیں اور اسی بنا پر انھوں نے

انجمن ترقیٔ اُردو (ہند) کی صدارت کو بخوشی قبول فرمایا
اور اسے اپنے نیک مشوروں اور امداد سے سرفراز
فرماتے رہتے ہیں۔ اگر کسی کو ہندستانی تہذیب کا
بہترین نمونہ دیکھنا ہو تو وہ سر تیج بہادر سپرو کو دیکھے۔
ان کی علمی معاشرتی اور سیاسی خدمتوں کے متعلق کسی
تفصیل کی ضرورت نہیں۔ اس سے ہمارے اہلِ
ملک بخوبی واقف ہیں۔ ان شعبوں میں ان کی یہ
سرگرمیاں اب بھی جاری ہیں۔ یونیورسٹیوں کے
کانوکیشن ایڈریسوں اور سیاسی تقریروں سے اُن کے
خیالات کا صحیح اندازہ ہوتا ہے۔ وہ جتھے بندی اور فرقہ
بازی کو سخت ناپسند کرتے ہیں اور باہمی اتحاد کے
بڑے حامی ہیں اور اس کو وہ ملک کی ترقی اور امن و

ان کی زندگی کے لیے سب سے مقدم خیال کرتے ہیں۔

وہ اس عمر میں بھی جوانوں سے زیادہ زندہ دل اور خوش مزاج ہیں اوران کے احباب ان کی پُرلطف باتوں اور لطیفوں اور گوناگوں خیالات سے لطف اٹھاتے ہیں۔

ہم خلوص دل سے دُعا کرتے ہیں کہ وہ صحت و وعافیت کے ساتھ سالہا سال زندہ وسلامت رہیں اور اسی سرگرمی کے ساتھ ملک کی خدمت کرتے رہیں۔

اُردو بحیثیت ذریعۂ تعلیم

[۷ نومبر ۱۹۲۵ء کو سر تیج بہادر سپرو نے
لکھنؤ یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد میں
صدارتی خطبہ پڑھا تھا۔ اردو زبان اور ذریعۂ تعلیم
سے متعلق اقتباس درج ذیل ہے۔]

ہماری طرز تعلیم کا سب سے زیادہ اہم پہلو جو
موافق اور مخالف میں سے کوئی بھی نظر انداز نہیں کرسکتا،
یہ ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں بلکہ اسکولوں تک میں ذریعۂ تعلیم
انگریزی زبان کو رکھا گیا ہے۔ اس پالیسی کے نتائج
بعض اعتبار سے نہایت افسوس ناک ثابت ہوئے۔

ہمارے بچّوں کی بہت بڑی تعداد کی تعلیم میں یہ ایک بڑی رُکاوٹ رہی کہ اُنھیں ایک غیر زبان میں تعلیم دی جاتی ہے اور خصوصاً ایسے مضامین کی تعلیم جن کے لیے ہرگز یہ ضروری نہیں کہ اپنی زبان چھوڑ کر کسی اور زبان میں پڑھائے جائیں۔ یہ پالسی ہمیں SIMON کا وہ طنز آمیز جواب یاد دلاتی ہے جو اس نے ایک ایسے شخص کو دیا تھا جس نے اپنے بچّوں کی تعلیم کے متعلق مشورہ طلب کیا تھا۔ اس نے کہا "انھیں وہ سب کچھ پڑھنے دو جو وہ کبھی نہ سمجھ سکیں گے"۔ مجھے مسرّت ہے کہ ہم ان دنوں اس پالسی کی غلطیوں کو سمجھ گئے ہیں مگر ہماری یونیورسٹیوں میں بہرحال اب بھی یہی پالسی جاری ہے۔ بنارس اور علی گڑھ نے بھی، جن سے توقع تھی کہ اس

سلسلے میں ایک رہنمایانہ قدم اٹھائیں گی، اسی پُرانے ڈگر
کو قایم رکھا۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ انھیں حالات نے مجبور
کر دیا مگر جامعہ عثمانیہ کی بنا ڈالنے والوں کی ہمّت
اور دوُر اندیشی قابلِ صد داد ہے کہ اُنھوں نے یہ جان کر
کہ ایک بدیسی زبان میں کتنی بھی دستگاہ حاصل کر لی جائے
وہ ہمیشہ اجنبی ہی رہتی ہے، شروع ہی سے یہ طے کر لیا کہ
ذریعہ تعلیم اُردوُ کو بنایا جائے۔ ان لوگوں نے پچھلے چند سال
کے اندر ہی کوئی ڈیڑھ سو اچھے معیار کی مختلف موضوعوں
کی کتابیں اُردوُ میں ترجمہ کر لیں اور اب ترقّی کے ایک
نئے دوُر کی ابتدا ہمارے سامنے ہے۔ نیز یہ کہ جنوبی ہند
میں ایک نہایت بھرپوُر اور مختلف قسم کا اُردوُ ادب
نشو و نما پا رہا ہے۔ اسی صوبے (متحدہ) کے ایک پروفیسر صاحب

نے جنھیں ایک مشہور ولایتی یونیورسٹی میں تعلیم پانے کا
شرف حاصل رہا ہی، کل ہی مجھ سے گفتگو میں کہا کہ
عثمانیہ یونیورسٹی کے ایک امتحان میں عمرانیات
(Civics) کی کاپیاں انھوں نے جانچیں اور ان
کاپیوں میں خیالات کی پختگی اور اظہار خیال کی خوش اسلوبی
سے بہت متاثر ہوئے۔ نیز یہ کہ یہ چیزیں انھیں ایسے
طلبہ کے جوابات میں کبھی نظر نہیں آئیں جو اظہار خیال
انگریزی میں کرتے ہیں۔

بار بار یہ کہا جاتا ہی کہ ہماری یونیورسٹیاں سچ
پوچھیے تو اسکولوں کی اعلیٰ جماعتوں سے ذرا بھی بہتر
نہیں ہوتیں۔ مگر میں قیاس نہیں کرسکتا کہ ولایتی یونیوسٹیوں
کا کیا حال ہوتا اگر انگریز بچّوں کو تاریخ، منطق، اخلاقیات

اور اصول قانون کی تعلیم فرانسیسی، جرمن یا اطالوی زبان میں
حاصل کرنا پڑتی۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہمیں اپنی یونیورسٹیوں
میں انگریزی کا رواج بالکل ترک کر دینا چاہیے۔ بلکہ اگر
قومیت کے بے جا فخر یا تنگ نظرانہ قومیت کی بدولت
کبھی ایسا وقت آیا کہ ہمارے بچے انگریزی ادب کی
رُوحانی مسرتوں اور بلند خیالی سے محروم کر دیے گئے تو
مجھ سے زیادہ شاید ہی کسی کو افسوس ہوگا کیونکہ انگریزی ادب
کی بدولت ہمیں بہت سے نئے خیالات اور نئے معیار
میسّر آئے ہیں۔ اور مجھے امید ہے کہ اس سلسلے میں کسی عاجلانہ
قدم اُٹھانے سے پہلے محض عملی وجوہ ہی ہمیں متنبہ کر دینے
کے لیے کافی ہوں گے۔ بعض مضامین یقینی ایسے ہیں کہ
اُن کی تعلیم ابھی ایک خاصے عرصے تک انگریزی زبان

ہی ہیں ہونی چاہیے جب تک کہ ہماری زبان کی پہلی
مہم بہت کچھ تکمیل کو نہ پہنچ جائے۔ میرا احتجاج انگریزی
کے استعمال یا انگریزی زبان کے مطالعہ کے خلاف
نہیں ہے بلکہ اس غفلت کے خلاف ہے جس کی بدولت
ہماری زبانیں پیچھے پڑ گئی ہیں۔

ایک ہندستانی اپنی انگریزی زبان کی مہارت پر
جتنا چاہے فخر کرلے مگر یہ سارا فخر ایک کمزور بنیاد پر ہوگا۔
اور اگر وہ خود اپنی زبان میں خوش اسلوبی اور وقار کے
ساتھ اپنے خیالات ادا نہیں کرسکتا تو اُسے بعض اوقات
ذلّت و شرم اور اپنی ذہنی اور ادبی فرومائیگی ضرور محسوس
ہوگی۔ طلاقت اور خطابت کے وہ مظاہرے جو ہمارے
بعض ال۔ال۔بی ضلع کی عدالتوں میں اکثر پیش کرتے ہیں،

اساتذۂ اُردو کو قبر میں بے چین کر دیتے ہوں گے جب ایک اچھے خاصے قابل اور لائق وکیل دوران بحث میں یہ کہتے ہیں کہ "میں امفیٹیکلی انکار کرتا ہوں کہ ڈفنڈنٹ نے یہ وِل ان ڈیو انفلوئنس سے اپنے حق میں کرائی" تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اُردو کا پاک صاف چشمہ یک بیک بالکل خشک ہو گیا ہے!

مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ ہم اپنی وراثت کو جو بالکل ہماری اپنی ہے، ایک ایسے خزانے کی تلاش کے پیچھے جس کا ملنا کوئی آسان بات نہیں، سرعت کے ساتھ بھولتے اور ضایع کرتے جا رہے ہیں۔ تجربہ تو یہ بتاتا ہے کہ بلند پایہ ادیبوں، شاعروں اور فلسفیوں نے اعلیٰ خیالات اپنی ہی زبان میں ادا کیے ہیں۔ جان ملٹن اپنی پیریڈائز لاسٹ،

لاطینی زبان میں لکھ سکتا تھا۔ اس کے سوانح نگاروں کا
بیان ہے کہ السنہ لاطینی اور یونانی میں اس کا علم اور مطالعہ
بہت گہرا اور وسیع تھا۔ مگر اظہار خیال کے لیے اس نے
اپنی ہی زبان منتخب کی۔ مائیکل مادھوسودن دت اور
رابندر ناتھ ٹیگور کا بنگالی زبان کو منتخب کرنا، ایسی ہی
دوسری مثالیں ہیں۔ لہٰذا لکھنؤ میں اور لکھنؤ یونیورسٹی کے
اراکین کو مخاطب کرتے ہوئے مجھے امید ہے کہ مجھے معاف
کیا جائے گا —— اگر میں یہ یاد دلاؤں کہ اُردو ادب
کا ان پر خاص حق ہے۔ اس زبان کو حقیر نہ ہونے دیجیے
جس زبان میں آتش، ناسخ، وزیر، رند، صبا اور
دیاشنکر نسیم شاعری کر گئے یا انیس اور دبیر نے مرثیے
لکھے ہیں۔ وہ زبان جس کے ذریعہ ابھی ایک نسل پہلے،

رتن ناتھ سرشار، شرر، سجاد حسین اور جوالا پرشاد برق نے غیر معمولی ذہانت کا ثبوت دیا۔ اس زبان کو محض اس لیے مٹنے یا بگڑنے نہ دیجیے کہ مغرب کا تقاضا زیادہ شدید ہے یا مغرب کا پیام زیادہ سودمند ہے! اس زبان کی غور و پرداخت کیجیے اور اس کو ترقی دیجیے اور مجھے یقین ہے کہ جب آپ اُن بلند خیالات اور گہرے جذبات کی ترجمانی کا ارادہ کریں گے جو آپ کے دل و دماغ میں موجزن ہوں گے تو یہ زبان آپ کا ہر طرح ساتھ دے گی اور کبھی کمی نہ کرے گی۔ اسی طرح فارسی اور عربی سے بھی اغماض نہ برتیے جو اُردو کی تحصیل کے لیے ضروری ہیں اور جن کی تعلیم کے قدیم مرکز اب بھی یہاں موجود ہیں۔

(۱۰)
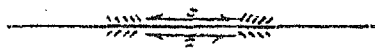
اُردو، ہندی، ہندستانی
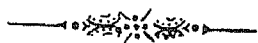
آج کل میں اکثر رسالوں، اور اُردو کی تصنیفات میں یہ دیکھتا ہوں کہ اس امر پہ زور دیا جاتا ہے کہ اُردو دکن میں پیدا ہوئی یا پنجاب میں یا کہیں اور۔ تاریخی نقطۂ نظر سے اگرچہ یہ بحث نہایت دل چسپ ہے لیکن زبان اور ادب کی ترقی پر مجھے اس کا اثر ہوتا ہوا نظر نہیں آتا۔ علمائے ادب کو اختیار ہے کہ اپنی تحقیقات سے اس کا مولد خواہ دکن قرار دیں خواہ دہلی مگر اس واقعے سے کسی شخص کو انکار نہیں ہو سکتا

کہ اس ڈیڑھ دو سو برس کے عرصے میں جو کچھ ترقی اُردو
زبان یا اُردو ادب میں ہوئی ہو وہ دہلی یا لکھنؤ میں
ہوئی ہو، گو مجھے اس بات کے اعتراف کرنے میں
کوئی عذر نہیں ہو کہ پچھلے بیس سال میں حیدرآباد
نے اُردو کی ترقی میں بہت نمایاں حصّہ لیا ہو۔ پچیس
برس پیشتر تک جب کوئی شخص اُردو کا تذکرہ کرتا تھا
تو اس سے مُراد زیادہ تر اُردو شاعری سے ہوتی تھی لیکن
اس پچیس برس میں شاعری کے علاوہ اور اصناف میں
بھی اُردو میں خاصی ترقی ہوئی ہو، اب کچھ کتابیں تاریخ
یا فلسفے یا اور مضامین پر اُردو میں نکل گئی ہیں اور اُن کو
پڑھ کر اُردو کی وسعت کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہو، اسی طور
پر ہمارے شاعروں کا بھی کچھ ڈھنگ بدل رہا ہو، پہلے

تو ان کو موئے میاں، چاہ زنخداں اور گل وبلبل وغیرہ کی بہت تلاش رہتی تھی اور اسی تلاش میں ان کی عمر صرف ہو جاتی تھی، لیکن اب شکر ہی کہ ہمارے شاعروں کی توجہ اور طرف بھی مبذول ہوئی ہے، ایران میں اس تیس چالیس برس کے اندر شاعری کا ڈھنگ بالکل بدل گیا، اور عصر جدید کے شعرا نے پرانی زنجیروں کو توڑ کر اپنے تخیل میں آزادی حاصل کر لی ہے اپنے ملک کی اصلاح میں اور اپنے وطن کی حوصلہ افزائی میں جو ایران کے شعرا نے حصّہ لیا ہی اُس سے کسی شخص کو جو عصر جدید کی شاعری سے واقف ہو انکار نہیں ہو سکتا، اگرچہ ابھی تک اردو شعرا پر تغزل کا رنگ بہت گہرا چڑھا ہوا ہی لیکن بتدریج وہ بھی بدل رہے ہیں، غالب

نے ستّر اسّی برس بیشتر انھیں قیود کو محسوس کر کے غالبؔ
یہ شعر لکھا تھا:-

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہیے وسعت مری زباں کے لئے

اگر وسعت زبان کی ہماری طرف سے سمجھ بوجھ کے
کوشش کی گئی تو میرے خیال میں بیس پچیس برس کے اندر
اردو ادب میں کافی ذخیرہ پیدا ہو جائے گا جس کے
ذریعے سے ابتدا سے انتہا تک اسی زبان میں تعلیم دینا
ممکن ہو جائے گا۔ میرا عرصے سے یہ عقیدہ رہا ہے کہ کسی
ملک کی تعلیم غیر زبان میں نہیں ہو سکتی، نہ کوئی شخص غیر
زبان میں کمال حاصل کر سکتا ہے ملٹن کے سے شاعر نے جو
لاطینی زبان کا اُستاد تھا جب پیراڈائز لاسٹ ـــــــ

لکھنے کا ارادہ کیا تو آخر کار اس نے یہی تجویز کیا کہ
کہ اپنی ہی زبان یعنی انگریزی میں اسے نظم کرنا چاہیے
چنانچہ جو شہرت ملٹن کو اپنی زبان میں "پیراڈائز لاسٹ"
لکھنے کی وجہ سے ہوئی وہ اظہر من الشمس ہے۔

انگریزی تعلیم یافتہ ہندستانیوں کی تعداد تیس یا
پینتیس کروڑ آدمیوں میں صرف چند لاکھ کی ہے، لیکن
بڑے سے بڑے ہندستانی کو ہر وقت یہ خوف رہتا
ہے کہ انگریزی بولنے یا لکھنے میں کوئی غلطی نہ ہو جائے۔
ایسے شخص ہندستانیوں میں جن کو انگریزی زبان پر
پوری قدرت حاصل ہو، یا جو محاورے اور ترتیب و
بندش الفاظ میں غلطی نہ کرتے ہوں، بہت کم ہیں اور
ہمیشہ کم رہیں گے۔ ہر زبان کا تعلق سوسائٹی کے نظام

سے ہوتا ہے، جب ہمارا طرز و طریق زندگی ہندستانی
ہے تو بہت سے الفاظ اور محاورے انگریزی زبان
کے ایسے ہیں جن کا اثر ہم پر ویسا نہیں ہو سکتا جو
انگریزوں پر ہوتا ہے، اسی طرح اگر بجائے انگریزی کے
ہندستان میں فارسی یا عربی کا عام طور پر رواج ہوتا تو
اس کا بھی ویسا اثر ہندستانی طبیعت پر نہ ہوتا جیسا
کہ ایرانیوں اور عربوں پر ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ اس کا تجربہ
ہندستان کو ہو چکا ہے۔

اسلامی عہدِ حکومت میں فارسی اور عربی کا بہت
کچھ زور ہندستان میں رہا لیکن ہندستانی مسلمانوں کو
بھی بہ حیثیت زبان دانی کے کبھی وہ رتبہ نصیب نہیں
ہوا جو ایرانی اور عرب ادیبوں کو حاصل ہے

اس مضمون پر مجھ سے پروفیسر براؤن سے کیمبرج میں
گفتگو ہوئی تھی، میں نے بہت ڈرتے ڈرتے ان سے
یہ پوچھا کہ آپ کے تجربے میں ایران میں کس ہندستانی
شاعر کی قدر کی گئی ہی، انھوں نے صرف خسروؔ کا نام بتایا
اور اس پر بھی یہ کہا کہ گو خسروؔ ہندستانی تھے یعنی یہ کہ ہندستان
میں رہے اور وہیں انھوں نے انتقال کیا لیکن نسل اُن
کی ہندستانی نہ تھی۔ مگر فارسی اور عربی کو چھوڑ کر جب
سے اُردو کی بُنیاد پڑی، ہندستانیوں نے جو اُردو میں
کمال حاصل کیا ہو اُس پر کسی غیر ملک والے کو اعتراض
کرنے کا حق حاصل نہیں ہی۔ میرؔ، سوداؔ، ذوقؔ، غالبؔ و
مومنؔ، آتشؔ و ناسخؔ، انیسؔ و دبیرؔ اُردو کے مالک
تھے، انھوں نے جن ترکیبوں اور محاوروں کی بُنیاد

ڈال دی خواہ وہ فارسی اور عربی کے لحاظ سے صحیح ہوں یا غلط، وہ اُردو میں مُروّج ہو گئے، بہ حیثیت بانیانِ زبان ان کو یہ حق تھا کہ وہ جس طرح چاہتے اُردو ترکیبوں کو قائم کرتے، ان کی زبان ٹکسالی زبان ہو گئی۔ ان کے محاورے یا ترکیبوں سے اختلاف کرنا یا تجاوز کرنا غلطی میں شمار ہوتا ہے۔ اسی طریقے سے عصر موجودہ کے جو اساتذہ ہیں ان کو بھی پورا اختیار ہے کہ نئے خیالات و محسوسات کو مناسب طریقے سے اُردو میں ادا کریں۔ ممکن ہے کہ بعض اوقات اُن پر بھی نکتہ چینی ہوتی ہو مگر رفتہ رفتہ ہم ان کی ایجادوں کے بھی عادی ہو جائیں گے اور ان کی ترکیبیں بھی زبان میں داخل ہو جائیں گی۔ خلاصہ یہ ہے کہ اپنی زبان اپنی ملکیت ہے اس کو

جس طرح ہم چاہیں استعمال کر سکتے ہیں اور اس میں
حسب ضرورت جو ترقی چاہیں کر سکتے ہیں، کسی شخص غیر
کی رائے یا اجازت کے ہم محتاج نہیں۔ ہماری زبان
ہمارے محسوسات و جذبات کی ترجمان ہے، جو نہ انگریزی
ہو سکتی ہے اور نہ کوئی دوسری زبان۔ میں اسی وجہ سے
ہمیشہ اس کا کوشاں رہا کہ اُردو کی ترقی ہو، مگر میں اس سے
ناواقف نہیں ہوں کہ جب اُردو کا تذکرہ کیا جاتا ہے تو
یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ہندی کی کیوں نہ ترقی ہو؟ میں
نہ ہندی کا بدخواہ ہوں اور نہ دشمن، گو اکثر ہندو اصحاب
کا یہ خیال ہے کہ مجھ پر اُردو یا فارسی کا اس قدر رنگ جما
ہُوا ہے کہ میں قریب قریب نیم مسلمان ہوں، میں نے
نہ کبھی یہ کہا اور نہ اس کی کوشش کی کہ ہندی کی ترقی

نہ ہو مگر واقعہ یہ ہے کہ پانچ برس کی عمر سے جب کہ میری تعلیم
شروع ہوئی ہے مجھے اُردو اور فارسی کا شوق رہا ہے اور اکثر
انھیں زبانوں کی کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا ہوں۔ اٹھاون
برس کی عمر میں نئے نئے شوق ذرا پیدا ہونے دشوار ہوتے
ہیں۔ اگر کسی کو یہ شکایت ہے کہ میں نے ہندی اور سنسکرت
کیوں نہیں پڑھی تو اس کا جواب دہ جہاں تک کہ میرے
عالم طفولیت کا زمانہ ہی میں نہیں بلکہ میرے بزرگ ہو سکتے
تھے۔ اور میرا خیال یہ ہے کہ میری عمر کے اکثر ہندوؤں کی
یہی کیفیت ہے، پچاس برس پیشتر اس صوبے میں کم سے
کم ان اطراف میں جہاں میں پیدا ہوا اور میری تعلیم ہوئی
متوسط درجے کے ہندوؤں میں عام طور پر یہی رواج تھا
کہ اُردو اور فارسی میں ان کی تعلیم شروع ہوتی تھی خواہ

اس کی وجہ یہ رہی ہو کہ اردو اور فارسی زبان ذریعۂ معاش تھی، خواہ کوئی اور وجہ ہو، لیکن واقعہ یہی ہو کہ دہلی میں جہاں میرے بزرگ رہتے تھے اور اس کے قرب وجوار میں جہاں میری تعلیم ہوئی یہی رواج تھا۔ اُسی رواج کے مطابق میری بھی تعلیم ہوئی مگر اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ میں ہندو ادب سے بالکل ناواقف ہوں یا میں نے واقفیت حاصل کرنے کی اپنے فرصت کے اوقات میں کوشش نہیں کی، میرا عقیدہ یہ ہو کہ کوئی ہندستانی اپنے تئیں ہندستانی کہنے کا مستحق نہیں ہو تاوقتیکہ وہ ہندو اور اسلامی تہذیب وادب سے تھوڑی بہت واقفیت نہ رکھتا ہو۔ میں موجودہ زمانے کے مسلمانوں کی اکثریت کی شکایت کرتا ہوں کہ انھوں نے ہندو تاریخ اور ہندو تمدن سے

واقفیت حاصل کرنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ اگرچہ
ایک زمانے میں مسلمانوں میں ایسے لوگوں کی کافی تعداد
مل سکتی تھی جنھوں نے ہندو ادب میں بھی ایک خاصہ
درجہ پیدا کر لیا تھا۔ تھوڑے دنوں کی بات ہے ایک مسلمان
نوجوان مجھ سے ملنے آئے انھوں نے تاریخ میں ایم۔اے
پاس کیا تھا۔ یونان، روم اور یورپ کی تاریخ سے انھیں
خاصی واقفیت تھی لیکن ہندو زمانے سے وہ بالکل ناواقف
تھے اور اس کا انھوں نے اقبال بھی کیا۔ اسی طرح اکثر
ہندو ایم۔اے بھی ایسے ملیں گے جن کو اسلامی تہذیب
اور اسلامی تمدن سے مطلق واقفیت نہیں۔

جب ایک معمولی تعلیم یافتہ ہندو کو یہ تعلیم دی گئی ہو
کہ مسلمان ہندستان کو لوٹنے کے لیے آئے تھے، محمود

غزنوی نے سترہ حملے کیے، مسلمان بُت شکن تھے، انھوں
نے آکر جابرانہ طور پر یہاں ۶۰۰ برس تک حکومت کی تو
کسی کو کیوں تعجب ہو کہ وہ مسلمانوں سے دل میں نفرت
رکھتا ہو، اسی طرح اگر کسی مسلمان بچّے کو شروع سے
یہ تعلیم دی جائے کہ ہندو جتنے ہیں سب بت پرست
ہیں، اُن کے دینیات میں بجز تعصبات کے اور کچھ نہیں
ہے، اور یہ مسلمانوں کے زیر حکومت ۶۰۰ برس تک رہ چکے
ہیں اور اب مسلمانوں سے تاریخی انتقام لینا چاہتے
ہیں تو کیا تعجب ہو اگر مسلمان ہندو سے نفرت کرے۔
اس چالیس برس کے اندر جس طرح کے بیج ہم نے
بوئے ہیں اسی طرح کے درخت اور اسی طرح کے
پھل ہمارے سامنے آرہے ہیں۔ اور اب پر ہر شخص

کو دعویٰ نیشنلزم کا ہی۔

آج کل یہ تماشہ ہو رہا ہی کہ ہندوؤں کے تعلیم یافتہ طبقے میں کھانے پینے کی تو عام طور پر قیدیں اُٹھ گئی ہیں، بلا تکلف ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے ساتھ عام جلسوں میں یہاں، یا غیر ملکوں میں جب جاتے ہیں تو خورد و نوش جائز رکھتے ہیں مگر یہی حضرات جب سیاسی معاملات میں گفتگو یا تقریر کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہی کہ ایک کو دوسرے سے گویا کچھ واسطہ ہی نہ تھا اس سے بہتر تو ہمارے بزرگ تھے جو پابند قیود تھے لیکن چشم مروّت رکھتے تھے، آپس میں دوستی اور اخلاص کا تعلق رکھتے تھے۔ ممکن ہی کہ یہ بے اعتمادی اُس آزادی اور پولٹیکل طاقت کا پیش خیمہ ہو جس کا ہم

سب دم بھرتے ہیں۔ جہاں اور نزاعات کی باتیں ہیں
وہیں ایک زبان کا بھی مسئلہ ہی، اپنے دل کے بہلانے
کے لیے اب ہم نے یہ وطیرہ اختیار کیا ہی کہ جب اُردو
اور ہندی کا تذکرہ ہوتا ہی تو ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ دونوں
زبانیں ایک ہی ہیں اور ہم کو بجائے اُردو اور ہندی
کے لفظ "ہندستانی" استعمال کرنا چاہیے، ممکن ہی کہ چالیس
یا پچاس برس پیشتر اس لفظ ہندستانی کا استعمال جائز
ہوتا لیکن اس وقت تو میرے خیال میں اس لفظ کے
استعمال سے یا تو اپنے دل کو بہلانا مقصود ہی یا ایک
دوسرے کو دھوکہ دینا۔ واقعہ یہ ہی کہ اس وقت اُردو
اور ہندی دو مختلف زبانیں بنتی چلی جا رہی ہیں، اُردو
کے ادیب اپنا یہ فرض سمجھتے ہیں کہ اُردو میں فارسی

اور عربی کے غیر مروج اور غیر مانوس الفاظ کی بھرمار کردیں،
اسی طرح ہندی کے ادیب اپنا یہ فرض سمجھتے ہیں کہ
ہندی میں بھی غیر مروج اور غیر مانوس سنسکرت کے الفاظ
بھر دیئے جائیں۔ پس میرے لیے یہ مان لینا غیر ممکن ہے
کہ ایسی اُردو یا ایسی ہندی کو ہم ہندستانی کا لقب دے
سکتے ہیں۔ مجھ کو تو اس کا خوف ہے کہ اگر یہی لیل و نہار
رہے تو وہ زمانہ دُور نہیں جب کہ اُردو داں کو ہندی داں
سے گفتگو کے وقت ایک ترجمان کی ضرورت ہوگی اور
اسی طرح اس کا برعکس۔ اگر واقعی ہم لوگوں نے یہ طے کرلیا
جو کہ اسی طریقے سے اُردو اور ہندی کی علیحدہ علیحدہ ترقی
ہو اور جو کچھ نتائج ہوں برداشت کریں تو کیوں نہ جرأت
کے ساتھ ہم اس کو مان لیں کہ اُردو والوں کو اُردو

کی ترقی کا استحقاق حاصل ہو اور ہندی والوں کو ہندی
کی ترقی کا۔ میرے خیال میں اگرچہ یہ بہتر ہوتا کہ ہندستانی
یعنی ایسی مشترکہ زبان جس کو عام طور پہ ہندو اور مسلمان
سمجھ جاتے رائج ہوتی، لیکن اب اگر یہ ناممکن ہو گیا ہو تو
ہم کم از کم یہ کر سکتے ہیں کہ غیر مانوس عربی اور فارسی
کے الفاظ اُردو سے اور غیر مانوس سنسکرت کے الفاظ
ہندی سے خارج کرنے کی کوشش کریں۔ کچھ عرصہ ہوا
کہ ایک وصیت ایک ہندو صاحب نے ایک وکیل
صاحب کی معرفت میرے پاس بھیجی۔ میں نے اسے
دو مرتبہ سُنا، ہندی میں لکھی ہوئی تھی۔ ستر فی صدی
الفاظ میں نہیں سمجھ سکا۔ ایسے ایسے قانونی الفاظ
سنسکرت کے اس میں لکھے گئے تھے جو میں نے اپنے

اڑتیس برس کے تجربے میں کبھی نہیں سُنے تھے۔ آخر کار
جب اُس کا ترجمہ انگریزی میں میرے سامنے پیش
کیا گیا اُس وقت میں قانونی رائے دے سکا۔ اب ایسی
دستاویز کو میں کیا کہوں، اُردو، ہندی یا ہندستانی ؟۔
میں اگرچہ سیاسی معاملات کے متعلق بہت کم
عرض کرنا چاہتا ہوں لیکن جو کچھ میں نے اوپر اشارہ
کیا ہے وہ محض اس وجہ سے کہ زبان کا بہت کچھ تعلق
سیاسی نظام سے ہوتا ہے۔ یورپ کے بعض ممالک میں
مثلاً پولینڈ یا السیس لورین میں جو زبان کے متعلق
آپس میں جھگڑے ہوئے ہیں اور ان سے جو نتائج
پیدا ہوئے اُن سے ہم کو سبق حاصل کرنا چاہیے۔
مگر وہاں تو یہ تھا کہ فاتح اور مفتوح کے درمیان

تنازعے تھے، یہاں یہ کیفیت ہو کہ یہ جھگڑے فاتح اور مفتوح کے درمیان نہیں ہیں بلکہ ایک ہی ملک کے باشندوں میں ہیں، اور اس پر لطف یہ کہ دونوں خواہان آزادی ہیں۔

میں نے رواروی میں اپنے مکرم دوست مولوی اصغر صاحب مدیر رسالہ ہندستانی کی فرمایش اور تقاضے کی وجہ سے اپنے چند خیالات کا غیر مسلسل طور پر اظہار کیا ہو، ممکن ہو کہ بعض اصحاب کو میرے خیالات سے اختلاف ہو، مگر میں انھیں یہ یقین دلانا چاہتا ہوں کہ میرے یہ خیالات مخلصانہ ہیں۔

(رسالہ "ہندستانی" جولائی ۱۹۳۲ء)
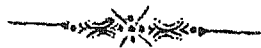
اُردُو دِن

[انجمن بہار ادب لکھنؤ کی درخواست پر ہندستان کے مختلف حصّوں میں ۱۸ دسمبر ۱۹۳۵ء کو اُردُو دِن بڑی کامیابی سے منایا گیا۔ کلکتہ، بمبئی، لاہور، دہلی، سری نگر، پشاور، راولپنڈی، علی گڑھ، آگرہ، لکھنؤ، پٹنہ اور الہ آباد کے علاوہ ہندستان کے بہت سے دوسرے شہروں اور قصبوں تک میں جلسے ہوئے جن میں اُردُو کے نام لیوا ہندو مسلمان سب شریک تھے لاہور کا جلسہ ڈاکٹر ایس ایس بھٹناگر (پنجاب یونیورسٹی) کی صدارت میں ہوا، دہلی کے جلسے کی صدارت جناب بشیشور ناتھ صاحب منوّر نے کی، علی گڑھ میں جناب

آنند سروپ صاحب بسمل، لکھنؤ میں جناب کرشن
پرشاد صاحب کول اور آگرہ میں پنڈت راج ناتھ صاحب
کنزرو نے جلسوں کی صدارت کی ۔ الہ آباد کے ایک
جلسہ کی صدارت رائے بہادر آر ۔ بی جینی نے کی
اور ایک جلسہ کی صدارت سر تیج بہادر سپرو نے فرمائی ۔
موصوف کی صدارتی تقریر کا ایک اقتباس درج
ذیل ہے ۔)

اُردو زبان ہم ہندو مسلمان دونوں کو اپنے آباو
اجداد سے ایک مشترکہ اور مقدس ترکہ کی حیثیت سے
ملی ہے جو قطعاً ناقابلِ تقسیم ہے اور یہی وہ زبان ہے جو
قریب قریب ہر صوبے میں کم و بیش بولی اور سمجھی
جاتی ہے مجھے یہ دیکھ کر بڑا قلق ہوتا ہے کہ تقریباً چالیس

پچاس سال سے یہ کوشش ہو رہی ہے کہ عوام غیر فطری طور پہ ایک بناوٹی زبان سیکھیں اور اس زبان سے کنارہ کشی اختیار کریں جو فطری طور پہ ہندو اور مسلمانوں کے میل جول سے پیدا ہوئی ہے اور ان کی آپس کی رواداریوں اور قربانیوں کا نتیجہ ہے۔ اُردو جو قطعاً وقت کی فطری ضرورت سے پیدا ہوئی ہے، مٹائی نہیں جاسکتی۔ اگر چند مٹھی بھر آدمی فرقہ وارانہ سوال پیدا کرکے اکثریت کے زعم میں اسے مٹانا چاہتے ہیں تو یہ سودائے خام ہے۔ اگر مسلمانوں نے اُردو کی اشاعت میں بہت کچھ کیا ہے تو ہندوؤں نے بھی کسی حالت میں اُردو کو ترقی دینے میں کمی نہیں کی ...... بعض لوگوں کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ ہم وہ زبان استعمال کریں جو دیہاتوں میں عام طور پہ بولی اور

سمجھی جاتی ہو لیکن جب کہ ہر گاؤں اور قصبے کی مقامی
بولی اور لب و لہجہ میں فرق ہو اور اس طرح دیہاتی اور
شہری محاوروں اور الفاظ میں فرق ہو تو آپ کہاں
تک ان کی تقلید کریں گے۔
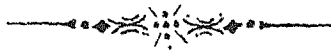
اُردُو زبان

(ایک عقیدہ)

"مجھے اُردُو زبان سے محبّت ہے۔ مَیں اس کو اپنی زبان سمجھتا ہوں اور اپنے ہندستان کی زبان! مجھے یہ کہتے ہوئے ذرا بھی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی کہ اُردُو میری مادری اور قومی زبان ہے۔ مَیں اِس کا کبھی قائل نہیں ہو سکتا کہ اُردُو مسلمانوں کی زبان ہے۔ بلکہ جتنا دعویٰ مسلمانوں کو اُردُو پر ہو سکتا ہے اُتنا ہی ہندوؤں کو بھی ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ اُردُو دراصل ہندو مسلم اتحاد سے پیدا ہوئی اور اس اتحاد کی واحد یادگار ہے۔ مَیں اُردُو

ہیں عربی، فارسی کے مشکل الفاظ کو داخل کرنے اور بلاوجہ
اُردو کو مشکل بنانے کا مخالف ہوں اور اسی طرح سنسکرت
الفاظ کے ٹھونسے جانے کا موئید نہیں ہوں[1]

---

[1] ۱۲؍فروری ۱۹۳۹ء کو لکھنؤ میں " یوم چکبست"
سر تیج بہادر سپرو کی زیرِ صدارت منایا گیا۔ اُس موقع پر جو مضمون
اور نظمیں پڑھی گئی تھیں اُن کا مجموعہ یادِ چکبست کے نام سے شایع
کیا گیا ہے۔ اس کا دیباچہ "عرض حال" کے عنوان سے پنڈت
برج کشن ٹوپا نے لکھا ہے۔ اس دیباچے سے سر سپرو کی تقریر کا
یہ اقتباس نقل کیا گیا ہے۔

سر تیج اور اُردو زبان

[رسالہ "بہارِ کشمیر" لاہور کا ایک خاص نمبر "یادِ چکبست" کے نام سے فروری ۱۹۳۹ء میں شایع ہوا۔ اس میں سر تیج بہادر سپرو کا یہ مضمون بھی شامل ہے۔]

ای رہ نوردِ عالمِ بالا چگونہٖ
ما بے تو در ہجوم تو بے ما چگونہٖ

ایڈیٹر صاحب "بہارِ کشمیر" کے ارشاد کی تعمیل مجھ پر واجب ہے۔ مَیں اس وجہ سے چند منتشر خیالات ضبطِ تحریر میں لا کر بھیج رہا ہوں۔ فارسی اور اُردو کی کتابوں کے مطالعے کا مجھے شوق رہا ہے لیکن نہ مَیں

عالم ہوں اور نہ ادیب ہوں۔ اور میں ہرگز اس کا
دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں کسی شخص کی شاعری پر رائے زنی
کروں یا اس پر تبصرہ لکھوں۔ البتّہ میں خوش ہوں کہ
کہ پنڈت برج نرائن چک بست کی وفات کے بعد اس
وقت یہ خیال پیدا ہوا کہ اُن کی زندگی و علمی مشاغل و
کلام کے متعلق اُن کے مدّاح اور قدردان اپنا خراج تحسین
اُن کی یادگار میں پیش کریں۔

پنڈت براج نرائن چک بست مرحوم مجھ سے عمر
میں چھوٹے تھے لیکن اُن کے اور میرے درمیان بزرگی
اور خوردی کا تعلّق نہ تھا بلکہ برابری کا تھا۔ حالانکہ وہ
پرانی تہذیب کے مطابق بذات خود مجھ سے ویسا ہی
برتاؤ کرتے تھے جیسا کہ کچھ عرصے قبل چھوٹے بڑوں

سے کرتے تھے۔ ایک رشتۂ اتحادِ باہمی یہ تھا کہ اُن
کو بھی اُسی نادرالوجود ہستی سے عقیدت تھی کہ جس سے
مجھ کو بھی تھی۔ میرا اشارہ پنڈت بشن نرائن درؔ مرحوم کی
طرف ہی۔ میرے لڑکپن کا زمانہ تھا کہ جب پنڈت
بشن نرائن درؔ لکھنؤ سے ولایت بغرض تعلیم تشریف
لے گئے اور مجھے خوب یاد ہی کہ کشمیری پنڈتوں میں
اُس وقت کیسا غُل و غوغا ہوا۔ برادری دو ٹکڑوں
میں منقسم ہوگئی، باہمی تعلّقات میں کشیدگی پیدا ہوگئی۔
مگر مَیں ان باتوں کا تذکرہ اس وقت فضول سمجھتا ہوں۔ اس
پچپن برس کے اندر کشمیری پنڈتوں کے طرز و طریق زندگی
میں و خیالات میں قریب ہر جگہ ایسا انقلاب عظیم
پیدا ہوگیا ہی کہ اگر پچاس برس پیشتر کے بزرگ اس

وقت دوبارہ پیدا ہوجائیں تو وہ اپنی اولاد کو پہچان نہ سکیں گے۔ پنڈت بشن نرائن کا اثر اِس صوبہ میں کشمیریوں تک ہی محدود نہ تھا بلکہ میرے زمانے کے ہر طبقے کے طالب علموں اور نوجوانوں پر بھی اُن کا بہت بڑا اثر پڑا۔ پنڈت بشن نرائن صاحب کی علمیت اور انشا پردازی اور شوقِ تحصیل کا اندازہ آج کل کے نوجوانوں کو نہیں ہوسکتا۔ اگر ہمارے صوبے میں پچاس برس پیشتر کسی نے آزادیٔ خیال و تحصیلِ علم کی بنیاد ڈالی تو پنڈت بشن نرائن دَر ہی نے ڈالی۔ مجھ کو اُن کی خدمت میں نیاز حاصل تھا۔ علاوہ اِس کے کچھ اُن سے قرابت بھی تھی۔ میں اُن کو اُستاد، ہادی اور رہنما سمجھتا تھا۔ اُن کی صحبت میں بیٹھنا میں عین سعادت سمجھتا تھا۔

پنڈت بشن نرائن صرف انگریزی کے جید عالم نہ تھے بلکہ فارسی اور اُردو میں بھی اُن کو کمال حاصل تھا۔ اور جہاں اُنھوں نے اپنے ہمعصروں میں اور شوق پیدا کیے وہاں فارسی اور اُردو کے شوق کو بھی اُنھوں نے بڑھایا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دفعہ اُنھوں نے یہ ارشاد فرمایا کہ تم جتنی چاہے زبانیں پڑھو مگر اپنی زبان اور اپنی تہذیب سے بے وفائی نہ کرو۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر پنڈت براج نرائن چکبست کے خیالات میں پختگی اور بلندی اِس قدر جلد پیدا ہوئی تو اس کا ایک بہت بڑا سبب یہ تھا کہ اُن کی علمی اور اخلاقی زندگی پنڈت بشن نرائن صاحب درؔ کی ذات بابرکات سے وابستہ تھی۔ چنانچہ اُنھوں نے اپنی ایک نظم میں

اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔

کیا زمانے میں کھُلے بے خبری کا مری راز

طائرِ فکر میں پیدا تو ہو اتنی پرواز

کیوں طبیعت کو نہ ہو بے خودئ شوق پہ ناز

حضرتِ آبر کے قدموں پہ ہے یہ فرق نیاز

فخر ہے مجھ کو اسی در سے شرف پانے کا

مَیں شرابی ہوں اسی رند کے میخانے کا

پنڈت دیا شنکر نسیم کے بعد اگر کشمیری پنڈتوں میں کوئی شخص ہوا ہے کہ جس نے اُردو میں ویسا ہی کمال حاصل کیا تو وہ برج نرائن چکبست تھا۔ برج نرائن چکبست کی شہرت اِس وقت ہندستان میں ایک طرف سے دوسری طرف تک پھیلی ہوئی ہے۔ کوئی حلقہ

اُردو والوں کا نہیں ہوگا جہاں برج نرائن چکبست
کا نام عزت اور احترام سے نہیں لیا جاتا۔ پچھلے سال
میں لکھنؤ کی "بزمِ بہارِ ادب" کے جلسے میں شریک تھا
وہاں صرف ہندو شعرا ہی نے نہیں بلکہ مسلمان اساتذہ
نے بھی بلا تکلف اور نہایت فراخ دلی کے ساتھ اُن
کے کلام کی تعریف کی اور تعریف ہی نہیں کی بلکہ لکھنؤ
کے بہترین زبان والوں میں اُن کا شمار کیا۔ شاید میرے
لیے یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ اس وقت پنڈت برج نرائن
چکبست کی شہرت نسیمؔ سے بہت زیادہ ہے اور اس کی وجہ
میری دانست میں یہ ہے کہ اب لوگوں کا مذاق بدل گیا ہے۔

اکنوں کرا دماغ کہ پرسد ز باغباں
بلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

اُردُو شاعری کے کئی دَوْر ہوئے ہیں۔ اس میں کلام
نہیں کہ اُردُو شاعری پر فارسی شعرا کا بہت بڑا اثر پڑا
ہے۔ گُل و بلبل کے قصّوں میں اُردُو شعرا ہمیشہ مبتلا
رہے ہیں۔ لیکن آج کل جیسا میں نے اوپر عرض کیا
ہمارا مذاق بدل گیا ہے۔ حالانکہ اس وقت بھی غزل گوئی
کا شوق قائم ہے اور اس صنف میں بڑے باکمال شعرا
موجود ہیں لیکن اب ایک دوسرا دھارا بہہ رہا ہے۔ فی زمانہ
نظم کا شوق ترقّی پذیر ہے۔ تبدیلیٔ مذاق کے مختلف اسباب
ہیں۔ مغربی تعلیم کا ہمارے خیالات پر عظیم الشان اثر
پڑا ہے۔ آزادی کے نعرے ہر طرف لگ رہے ہیں۔
وطن پرستی کا غلبہ روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ ایسی حالت
میں یہ غیر ممکن تھا کہ اس عصرِ جدید کے شعرا پر ان

تمام باتوں کا اثر نہ پڑے۔ چنانچہ پنڈت برج نرائن
پر بھی بہت گہرا اثر پڑا ہے۔ حالانکہ پنڈت صاحب مرحوم
نے غزل گوئی میں بھی اپنی نازک خیالی اور زباں دانی
کا سکّہ جما دیا مگر حقیقت یہ ہے کہ نظم میں اُنھوں نے
خاص طور پر کمال حاصل کیا۔ ان کے طرز بیان پر جیسا
کہ ایک مضمون سابق میں لکھا تھا لکھنؤ کی ٹکسالی زبان
کی مہر لگی ہوئی ہے۔ آتشؔ و انیسؔ و دبیرؔ کے
رنگ میں اُن کی زبان ڈوبی ہوئی ہے اور اسی زبان
میں اُنھوں نے قلبی وارداتوں کو ادا کیا ہے۔ یہ میں
جانتا ہوں کہ چند نکتہ چینوں اور حریفوں نے ان کی
زبان پر بھی اعتراض کیا ہے لیکن منصف مزاج شخصوں
کو یہ ماننا پڑے گا کہ اُن کی زبان لکھنؤ کے بہترین طبقہ

کی زبان کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ زبان دانی سے قطع نظر کرکے میرا یقین ہے کہ چکبست کے کلام میں جو درد ہے وہ بہت کم اُن کے ہمعصر شعرا کے کلام میں پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ اُنھوں نے خود کہا ہے۔

جو خود نہیں سرگرم کرے گا وہ بشر کیا
جب دل میں نہیں درد زباں میں ہو اثر کیا

ان کی زبان دانی اور شاعری کے متعلق میں صرف یہ عرض کروں گا کہ میں نے اس دیباچہ میں جو کہ قریب بارہ برس ہوئے لکھا تھا یہ عرض کیا تھا کہ جس قدر زمانہ گزرتا جائے گا اور اُردو شاعری مصنوعی قیود سے آزاد ہوتی جائے گی اور آزادی کی فضا میں اس کو نشو و نما پانے کا موقع ملے گا برج نرائن کی شہرت بتدریج بڑھتی جائے گی۔

اور آئندہ نسلیں اس امر کو تسلیم کریں گی کہ وہ دوْرِ جدید
کے رہنماؤں میں سے ہیں۔ اب میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ اُن
کی وفات کے بعد ان اطراف میں تو یہ دعویٰ بدرجۂ ثبوت
پہنچ گیا ہے۔

اگر شعر گوئی میں برج نرائن چکبست نے
ایسا کمال حاصل کیا جو ہمارے لیے مایۂ ناز ہے تو ان
کی زندگی بھی ایسی جیتی جاگتی مثال راست بازی،
بلند خیالی، وطن پرستی، وفاشعاری اور نیک چلنی کی
تھی کہ جس کا اندازہ صرف انھیں کو ہو سکتا ہے جو اُن
کے زیرِ اثر تھے۔ ایسی ہستیاں زمانے میں بہت
کم ہوتی ہیں اور جو لوگ اُن کے ہمعصر رہ چکے ہیں
اور اس وقت بقیدِ حیات ہیں اُن کے لیے یہی خیال

کرنا ہی، کہ وہ ایک زمانے میں اُن کے ہمعصر تھے
اور اُن کی صحبت سے فیض یاب ہوتے تھے،
باعث فخر ہی۔

زبان اور قومی تعلیم

[جامعۂ عثمانیہ کے جلسۂ تقسیم اسناد (۱۹۳۹ء) میں
رائٹ آنریبل ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو، پی۔سی،
کے۔سی۔ایس۔آئی، ایم۔اے، ال۔ال۔ڈی
(الہ آباد) ڈی۔سی۔ال (آکسفورڈ) ڈی لٹ (بنارس)
ال۔ال۔ڈی (عثمانیہ) نے صدارت فرمائی تھی۔
صدارتی خطبہ کے کچھ اقتباس درج ذیل
ہیں۔]

تقریباً پندرہ سال کی بات ہے کہ مجھ سے لکھنؤ میں اسی
قسم کا خطبہ دینے کی خواہش کی گئی تھی۔ اس موقع پر
میں نے آپ کی جامعہ کو جو اُس وقت زندگی کی ابتدائی
منزلوں ہی میں تھی اس کی اُس جرات اور ہمّت پر

مبارک باد دی تھی جس کا ثبوت آپ نے ایک ہندستانی
زبان کو ذریعۂ تعلیم بنا کر دیا تھا۔اس کے بعد سے مجھے
اس مسئلے پر مزید غور کرنے کا موقع ملا ہی اور جیسے جیسے
زمانہ گزرتا جاتا ہی میرا یہ یقین پختہ ہوتا جاتا ہی کہ کسی غیر
زبان کے ذریعے ایک پوری قوم کو تعلیم دینا ناممکن ہی۔
اس میں ذرا شک نہیں کہ اگر کوئی شخص ایک یا ایک
سے زیادہ غیر ملکی زبانیں اچھی طرح جانتا ہو تو اس کا
لطف زندگی دو بالا اور اس کی نظر وسیع ہو جاتی ہی
لیکن اس کے باوجود میرا دعویٰ ہی کہ ہم اپنے نوجوان
مردوں اور عورتوں کو کسی بڑے پیمانے پر غیر زبان کے
ذریعے تعلیم دے کر وہ نتائج حاصل نہیں کر سکتے جن
کی توقع ہمیں کسی ملکی زبان کو ذریعۂ تعلیم بنانے سے

ہوسکتی ہے۔ میں ان بعض نازک مزاج حضرات
کی دل آزاری کرنا نہیں چاہتا جن کی قومیت
کا تخیل کسی خاص ہندستانی زبان کے ساتھ
وابستہ ہے۔ میرے لیے صرف یہ مان لینا کافی ہے
کہ اُرْدُوْ سرتاپا ایک ہندستانی زبان ہے جو دکن
میں پیدا ہوئی، دِلّی میں اس نے نیا جنم لیا اور
اس کی اُٹھان اور ترقی میں شمالی ہندستان
اور خود آپ کے حصۂ ملک یعنی دکن نے
قابل قدر حصّہ لیا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں
آپ کے حصۂ ملک کی دوسری زبانوں کو نظرانداز
کرتا ہوں یا ان کی ناقدری کرتا ہوں بلکہ مجھے تو یہ معلوم
کرکے خوشی ہوتی ہے کہ دوسری ہندستانی زبانوں کا

ممنوع کرنا تو درکنار، آپ کی جامعہ نے ان کی تعلیم کا
انتظام کیا ہی۔ اُردو زبان کو میں جو اہمیت دیتا ہوں
اس کی وجہ یہ ہی کہ میں محسوس کرتا ہوں کہ گزشتہ زمانے
میں وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان
تہذیبی تعلق اور میل جول کا ایک زبردست
رشتۂ اتحاد رہ چکی ہی اور یہ کام وہ آج بھی کر سکتی
ہی اور ہندستان کے اکثر حصّوں میں کر رہی ہی۔
انسانی تجربہ شاہد ہی اور کم از کم ہمارا تجربہ تو یہی بتاتا ہی کہ
اگر ایک طرف مذہب اور سیاسیات سماج کو گروہوں
میں ٹکڑے ٹکڑے کر کے اختلاف رائے کو تیز اور
تلخ کر دیتے ہیں تو دوسری طرف ایک مشترکہ تہذیب
کی پیروی سے ہمارے دل ملتے اور آپس کی یہ تلخیاں

ہلکی ہو جاتی ہیں۔ یہی وہ تجربہ ہے جو آپ اپنی جامعہ میں
کر رہے ہیں اور باوجود اس اختلاف رائے کے جو اس
مسئلے پر ہو رہا ہے میری دلچسپی اس کے ساتھ اسی
طرح برقرار ہے اور سچ پوچھیے تو اختلاف رائے سے
مفر بھی نہیں ہے۔ نکتہ چینی بے شک فائدے کی چیز ہے
بشرطیکہ وہ صحیح اور سچّی ہو، لیکن اگر اس سے راہوں میں
گمراہی اور مقصد میں چھچھوراپن پیدا ہو جائے تو اس کا
مدعا فوت ہو جاتا ہے۔

آپ کی جامعہ کی ایک خصوصیت جس نے مجھے
خاص طور پر متاثر کیا وہ بحیثیت جامعہ کے ایک ضروری
جز کے سررشتہ ترجمہ و تالیف کا قیام ہے۔ تاریخ قدیم
وجدید، سیاسیات، دستور انگلستان، معاشیات، فلسفہ،

مابعد الطبیعیات، اخلاقیات اور سائنس کی جن کتابوں
کو آپ نے ترجمہ کرکے شایع کیا ہو ان کی فہرست کسی
طرح بھی ناقابل لحاظ نہیں کہی جاسکتی اور مجھے یہ دیکھ کر
مسرت ہوئی ہو کہ اس کام کے متعلق جو نظام عمل آپکے
پیش نظر ہو وہ مکمل ہو جانے پر ہمارے ذہن اور تہذیبی
سرمایہ میں اہم اضافہ کرے گا۔ آج کل جو حالات ہیں
ان میں ہمیں سوائے اس کے کوئی چارہ نہیں کہ ہم
غیر ملکوں کی کتابیں ترجمہ کرکے اپنے تہذیبی اور
ادبی سرمایہ کے اضافہ پر کافی توجہ صرف کریں۔ اگر
ملک کے نوجوانوں کو آیندہ ہندستانی زبانوں ہی
میں تعلیم دینا ہو تو خود اپنی زبانوں میں کافی، مناسب
ور روز افزوں ذخیرۂ ادبیات کے پیدا کرنے کی

ساری ذمہ داری ہماری یونیورسٹیوں پر ہے اور وہ کسی طرح
اس سے پہلو تہی نہیں کرسکتیں۔ پروفیسر ہٹی لکھتے ہیں "عربوں
کے علم و فضل کے خزانے مغرب میں منتقل کرنے کا خاص
واسطہ طلیطلہ (TOLEDO) تھا جو سنہ ۱۰۸۵ء میں یعنی مسیحی فتح
کے بعد بھی اسلامی علم و فضل کا باعث بنا رہا۔ یہیں
اسقف اعظم ریمنڈ اول (سنہ ۱۱۲۶ء۔ سنہ ۱۱۵۱ء) کی کوشش
سے ترجمہ کا ایک باضابطہ ادارہ قائم ہوا جس میں
سنہ ۱۱۳۵ء اور سنہ ۱۲۸۴ء کے درمیان کئی مترجمین پیدا
ہوئے یورپ کے دور دراز حصوں سے علم کے شوقین
یہاں کھنچے چلے آتے تھے، ان میں انگلستان کے لوگ
مثلاً مائیکل اسکاٹ (Michael Scott) اور رابرٹ
آف چیسٹر (Robert of Chester) بھی تھے سنہ ۱۱۴۵ء میں

رابرٹ نے الخوارزمی کے جبر ومقابلہ کا پہلا ترجمہ کیا۔
اسی شخص نے ۱۱۴۳ء میں مقدس پیٹر (Peter the
(Venerable) کے لیے ڈالمیشیا کے باشندے ہرمان
(Hermann) کے ساتھ مل کر لاطینی زبان میں قرآن شریف
کا پہلا ترجمہ تیار کرلیا تھا"۔ خود ہماری تاریخ بھی اس قسم
کی متعدد مثالیں پیش کرسکتی ہو۔ غالباً آپ کے سامنے
عہد مغلیہ کے ان علما کے نام گنانے کی چنداں ضرورت
نہیں ہو جنھوں نے سنسکرت یا اور دوسری ہندستانی
زبانوں کی کتابوں کے فارسی میں ترجمے کیے۔ خود انگریزی
عہد کے ابتدائی زمانے میں ہماری زبانوں کے بہت
کچھ ترجمے انگریزی میں کیے گیے لیکن زمانہ بدل گیا ہو
اور اب ہمیں اس کی ضرورت آن پڑی ہو کہ ہم غیر زبانوں

کی کتابوں کا ترجمہ اپنی زبانوں میں کریں۔ اسی لیے میں
آپ کی جامعہ کے اس کام کو بہت اہم سمجھتا ہوں۔ میں
بلا تامّل یہ کہنے پر آمادہ ہوں کہ آپ کے زیر اہتمام اُردو میں
جو کتابیں ترجمہ ہوئی ہیں میں نے ان میں سے کئی کتابیں
پڑھی ہیں اور بجز ایک اعتراض کے جو میں بہت صاف
دلی کے ساتھ ابھی کروں گا، ان کتابوں سے صرف میری
دل چسپی ہی نہیں ہوئی بلکہ میں نے آپکے ترجموں سے
بہت کچھ استفادہ بھی کیا ہے۔ مجھے جو اعتراض ہے وہ یہ ہے
کہ اکثر مجھے یہ خیال ہوا ہے کہ آپ کے دارالترجمہ کی طرف
سے جو کتابیں شایع ہوتی ہیں ان میں عربی اور فارسی کے
مشکل لفظوں کے استعمال کا کھلا ہوا رجحان پایا جاتا ہے۔
براہ کرم میری طرف سے کسی غلط فہمی کو اپنے دل میں
راہ نہ دیجیے۔ میں مانتا ہوں کہ فنی اصطلاحیں اور جملے

ترجمہ کرتے وقت یا عوام کے روزمرّہ کی بجائے تہذیب
کی زبان میں کچھ لکھتے وقت، عربی اور فارسی کے ذخیروں
سے کام لیے بغیر چارہ نہیں، تاہم اس بات پر زور دینا
چاہتا ہوں کہ اگر آپ اُردو کی سچّی خدمت کرنا چاہتے
ہیں تو آپ عبارت کی سادگی پر نظر رکھیں اور آسانی
سے سمجھ میں آجانے والے الفاظ کی بجائے خواہ وہ
فارسی، عربی، سنسکرت یا انگریزی کی زبان کے ہوں
غیر مانوس اور مشکل الفاظ استعمال نہ کریں۔ ایران کے
آج کل کے مصنفین کے رجحان کے متعلق میرا کچھ کہنا
اگر جسارت نہ سمجھا جائے تو میں یہ عرض کروں گا کہ یہ لوگ
بعض مغربی زبانوں کے الفاظ بھی بلا تکلف اپنی تحریر میں
داخل کر لیتے ہیں اس سے زیادہ میں اس موضوع پر
کچھ اور نہ کہوں گا۔

---

(۵۷)

فرقہ وارانہ ذہنیت

اور

اُردُو زبان

(اگست سنہ ۱۹۳۹ء میں لکھنؤ کے ایک جلسہ میں تقریر۔)

ہندستان میں اُردو کا مستقبل کیا ہوگا؟ اس سوال کا جواب دینا آسان نہیں ہے۔ بہرحال میں امید کرتا ہوں کہ اگر وہ لوگ جن کو اُردو سے دلچسپی ہے اور جو اُردو کو اپنی زبان سمجھتے ہیں۔ اپنی کوشش میں

کوتاہی نہ کریں گے تو وہ باوجود ان حملوں کے جو عملی طور
پر اس زبان پر اس وقت ہو رہے ہیں، اس کو نہ صرف
محفوظ رکھ سکیں گے بلکہ اس کی توسیع بھی کر سکیں گے۔
میں اور صوبجات کی نسبت تو اس وقت تذکرہ نہ کروں گا
مگر یہ بات ضرور عرض کروں گا کہ صوبجات متحدہ، بہار اور
پنجاب میں یہ زبان عام طور پر کم از کم تعلیم یافتہ طبقوں
میں تو اس وقت تک مروّج رہی ہے اور یہی رشتہ باہمی
اتفاق کا ہندو مسلمانوں کے درمیان رہا ہے۔ اگر اس رشتہ
کو اس وقت توڑ دیا گیا تو میرے خیال میں ہندو اور
مسلمانوں میں جو اختلافات ملک کی بدنصیبی سے اس
وقت پیدا ہو گئے ہیں، ان کو رفع کرنا قریب قریب
غیر ممکن ہو جائے گا۔ میں اُردو کے مسئلے کی اہمیت

بمقابلہ اور اسباب اختلاف کے بہت زیادہ سمجھتا ہوں
کیونکہ ہر ملک میں اندرونی خیالات اور جذبات کے
اظہار کرنے کا ذریعہ مشترک زبان ہی ہوتا ہے۔

یہ میں جانتا ہوں کہ اُردو کے مٹانے کے لیے
کوئی احکام منجانب حکومت صادر نہیں ہوئے ہیں اور
اب بھی عدالتوں اور دفتروں میں اس صوبہ میں اُردو ہی
مستعمل ہوتی ہے لیکن عملی طور پر آج کل دیکھ رہا ہوں کہ
معمولی عام فہم الفاظ جن کا تھوڑا بہت بھی تعلق فارسی
یا عربی سے ہے وہ گفتگو اور تحریر سے خارج کیے جا رہے
ہیں اور ان کی بجائے سنسکرت کے الفاظ جن سے
کان آشنا نہیں ہیں، داخل کیے جا رہے ہیں۔ میں اس
سے انکار نہیں کرتا کہ جس طرح یہ اعتراض ہندوؤں پہ

وارد ہوتا ہے۔ اسی طرح بعض مسلمانوں پر بھی ایک حد تک
ضرور وارد ہو سکتا ہے یعنی اُردو کے بعض اخباروں اور
رسالوں میں بجائے عام فہم الفاظ کے عربی اور فارسی
کے مشکل اور ادق الفاظ استعمال کرنے کی کوشش
ہوتی ہے۔ افسوس ہے کہ اس کشاکش میں وہ اُردو جس
نے دہلی اور لکھنؤ میں نشو ونما پائی اور جس کے گرویدہ
تمام ہندو اور مسلمان تھے، تباہ ہوتی چلی جا رہی ہے۔
میں ان دلائل سے بخوبی واقف ہوں جو آج کل ایک
نئی زبان کے پیدا کرنے کی تائید میں پیش کیے جاتے
ہیں۔ کسی ملک میں زبان کی ترقی کا معیار دیہاتی محاورے
پر قائم نہیں کیا جاتا۔ ہر ملک کی شہری اور دیہاتی زبان
میں فرق ہوتا ہے۔ اگرچہ بنیاد ایک ہی ہوتی ہے۔ پس یہ

کہنا کہ ہم کو وہ زبان بولنی چاہیے جو دیہات میں سمجھی جاتی ہو، میرے خیال میں نہ صرف اُردو کو بلکہ ہندی کو بھی تباہ کرنا ہی۔ اگرچہ میں خود پسند کرتا ہوں کہ جہاں تک ممکن ہو عام فہم الفاظ استعمال کیے جائیں۔ لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ علمی اور ادبی زبان بازاری زبان سے مختلف ہوتی ہو اور علم و ادب، فلسفہ اور شعر و سخن کے لیے لازم ہو کہ زبان کا ذخیرہ بہت وافر ہو اور اس لیے میں کوئی وجہ نہیں دیکھتا کہ جو الفاظ صدہا سال سے مقبولِ عام ہو گئے ہیں اُن کو اس وقت زبان سے خارج کیا جائے۔

چند دنوں کی بات ہو کہ ایک قانونی دستاویز میرے سامنے مشورہ کے واسطے رکھی گئی۔ یہ آٹھ صفحے

کی دستاویز تھی مگر اس میں مشکل سے دس پندرہ الفاظ
ایسے تھے جن کو میں سمجھ سکتا تھا۔ باقی الفاظ کے سمجھنے
کے لیے مجھے ایک اور صاحب کی امداد کی ضرورت
پڑی جو سنسکرت سے بخوبی واقف تھے۔ اس دستاویز
میں جائداد منقولہ وغیر منقولہ جیسے عام فہم الفاظ کے
بجائے "چل سمپتی" اور "اچل سمپتی" درج تھے جن
کو میں نے اپنے ۴۴ برس کے تجربے میں کسی قانونی
دستاویز میں آج تک نہیں پڑھا تھا۔ ایک اور لفظ ہے
کہ جس کی طرف آپ کی توجہ دلاؤں گا۔ خزانچی کا لفظ
ایک ایسا لفظ ہے جس کو صرف ضلع بجنور کے دیہاتی
ہی نہیں بلکہ بلیا، بستی اور گورکھپور کے اضلاع کے
دیہاتی بھی سمجھ جائیں گے۔ مگر اس کی بجائے آج کل

ایک طبقہ میں جو لفظ رائج کیا جا رہا ہے وہ "کوشا دھیکش" ہے
چنانچہ میں نے اپنے چند دوستوں کے سامنے دو ملازموں
کو جن میں سے ایک ہندو تعلیم یافتہ شخص ہے اور جو روزمرہ
ہندی اخبار پڑھتا ہے بلایا اور کہا کہ جاؤ "کوشا دھیکش" کو
بلا لاؤ۔ یہ سن کر ملازم نے بار بار مجھ سے کہا کہ میں سمجھا نہیں
کہ آپ کس کو بلانا چاہتے ہیں۔ اس کے بعد انہی کے سامنے
میں نے اپنے ایک عیسائی ملازم سے جو کہ گوا کا رہنے
والا ہے۔ کہا کہ جاؤ "خزانچی" کو بلا لاؤ۔ وہ یہ سنتے ہی فوراً
میرے اس محرر کو بلا لایا جو روپے پیسے کا حساب رکھتا ہے۔
مجھے "کوشا دھیکش" کے لفظ پر اعتراض نہیں ہے۔ ممکن
ہے کہ پچاس ساٹھ برس بعد یہ لفظ مقبول عام ہو جائے
مگر یہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس وقت کون سی ایسی قومی

یا لسانی ضرورت لاحق ہوئی ہو جس کی بنا پر "خزانچی"
جیسے عام فہم لفظ کو چھوڑ کر "کوشا دھیکش" کو رائج کیا جا رہا
ہو؟ اب میں اس کے مقابلے میں ایک اور مثال دوں گا۔
لفظ "تھرمامیٹر" اگرچہ انگریزی لفظ ہو لیکن ہر متوسط طبقہ
کے گھر میں یہ لفظ سمجھا جاتا ہو، مگر میں نے اپنے ایک مسلمان
دوست کو اس کے بجائے "آلہ مقیاس الحرارت" کہتے
ہوئے سُنا۔ ممکن ہو یہ لفظ عرب میں اس وقت رائج ہو
لیکن ہندستان میں تو میں اسے اُردو کہنے کے لیے تیار
نہیں ہوں۔ جیسے کہ ہم نے ہزار ہا الفاظ عربی فارسی سنسکرت
اور ہندی کے اُردو میں داخل کر لیے ہیں اسی طرح
انگریزی کے الفاظ بھی ہماری زبان میں داخل ہو گئے
ہیں۔ اور وہ عام فہم ہو گئے ہیں۔ مثلاً اس صوبے میں

کلکٹر۔ کمشنر۔ جج۔ ہائی کورٹ۔ ریلوے اسٹیشن۔ بائیسکل۔ موٹر ایسے الفاظ ہیں جو ہر شخص سمجھتا ہے اور جو ہماری زبان میں جاذب ہو گئے ہیں۔ میرے خیال میں ایسے الفاظ کا ترجمہ عربی، فارسی، سنسکرت یا ہندی کے الفاظ میں کرنا زبان کے ساتھ بدسلوکی کرنا ہے اور اس کی روز افزوں ترقی اور وسعت کو روکنا ہے۔

مجھے اس پر اعتراض نہیں ہے کہ ہندو ہندی کی طرف متوجہ ہو رہے ہیں اور نہ اس پر اعتراض ہے کہ مسلمان عربی فارسی پڑھتے ہیں۔ مگر اس پر ضرور اعتراض ہے کہ اس زبان پر جس کی بنیاد ہندو اور مسلمان دونوں نے ڈالی ہے۔ اور جس کی ترقی میں دونوں نے پچھلے زمانے میں کوشش کی ہے۔ اور جس کو میں مشترکہ زبان ہندو اور مسلمانوں

کی سمجھتا ہوں۔ اس کو ہندو اور مسلمان اپنی تنگ نظری
اور تنگ خیالی کی وجہ سے تباہ کریں۔ میرے خیال میں
اس میں ہندوؤں کی محض اس وجہ سے کہ ان کی تعداد
زیادہ ہی، زیادہ ذمہ داری ہی کہ وہ اپنی طرف سے عملی طور
پر اُردو کو کہ جس کو میں اپنے طور پر مشترکہ زبان سمجھتا ہوں،
خراب نہ کریں۔ اس زبان کا تعلق اس تہذیب سے ہی
جس کو نہ میں اسلامی تہذیب کہتا ہوں اور نہ ہندو تہذیب'
بلکہ وہ ہندو مسلمانوں کی ایک مشترکہ تہذیب ہی جو مغلوں
کے وقت میں پیدا ہوئی۔ اس تہذیب نے ہندو مسلمانوں
کے درمیان ہم مذاقی کا لطف پیدا کر دیا، جو اب تک باوجود
دیگر انقلابات کے قائم ہی۔ اس میں یہ بات نہ بھولنا چاہیے
کہ اُردو کا یہ مسئلہ محض زبان کا مسئلہ نہیں ہی بلکہ مجموعی طور پر

اور درحقیقت تہذیب کا مسئلہ ہے۔ میں اس لفظ تہذیب
کو اس کے وسیع معنی میں استعمال کر رہا ہوں۔ پس
اکابرانِ قوم کا فرض ہے کہ وہ اس بات پر غور کریں کہ
اگر ہم نے یہ تہذیب مٹادی تو ہم اس کے بجائے کون
سی تہذیب قائم کریں گے؟

(۶۸)
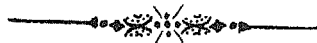
کشمیر اور اُردو زبان

[بزم اُردو سری نگر کے زیر اہتمام ۲۵ اگست ۱۹۳۹ء کو ایک مشاعرہ سر تیج بہادر سپرو کی صدارت میں منعقد ہوا تھا۔ یہ تقریر سر سپرو نے اس موقع پر فرمائی۔]

حضرات! آپ کی بزم ادب کے اس جلسے کی صدارت کا جو اعزاز آپ نے مجھے بخشا ہے اس کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا کہ میں شاعر ہوں، البتہ یہ بات ضرور ہے اور میں اس کا اقرار کرنے کے

لیے تیار ہوں کہ مجھے اُردو فارسی سے دلچسپی رہی ہو
اور ہو۔ گو میں یہ کہنے کے لیے تیار نہیں کہ میں ہر کلام سمجھتا
ہوں۔ مجھے سخت افسوس کے ساتھ اس امر کا ذکر کرنا پڑتا
ہو کہ جہاں ہندستان میں کئی اور شورشیں بپا ہیں وہاں زبان
کا مسئلہ بھی بیچ میں گھسیٹ لیا گیا ہو۔ مجھے یہ کہنے میں
مطلق تامل نہیں کہ میں اُردو زبان کا حامی ہوں اور
اس پیرانہ سالی میں بھی اگر میں اُردو زبان کی کوئی خدمت
کرسکوں تو میں اپنے لیے سعادت سمجھوں گا۔ اگر کوئی زبان
ایسی ہو جو پشاور سے لے کر سی۔ پی اور بمبئی اور مدراس
کے بعض علاقوں میں سمجھی جاسکتی ہو اور جس کی بدولت
ہمیں سارے ملک کے سفر میں آسانی ہوسکتی ہو تو وہ اُردو ہی ہے۔
اگر مسلمان یہ دعویٰ کریں کہ اُردو ان کی ایجاد اور

ان کی ساختہ پرداختہ ہو تو مجھے اس سے قطعی انکار ہی
اور اگر ہندو ایسا دعویٰ کریں تو وہ بھی غلط۔ اس کے
بنانے اور ترقی دینے میں دونوں کا برابر حصّہ ہی۔ آج
کل ہندو اُردو سے متنفر ہو رہے ہیں اور مسلمان ہندی
سے۔ اس لیے بعض اصحاب ایک نئی زبان "ہندستانی"
کے رواج دینے پر تُلے ہوئے ہیں۔ میں نے اس کی اکثر
شکایت کی ہی اور اب بھی اس کا اظہار کرتا ہوں کہ
اس کے رواج دینے میں ڈاکٹر عبدالحق نے
بھی کچھ حصّہ لیا ہی۔ "ہندستانی" کوئی زبان نہیں۔ اس کا
کچھ مطلب نہیں۔ تامل، تیلگو، بنگلہ، گجراتی اور دوسری
زبانیں بھی ہندستانی کہی جاسکتی ہیں۔ اگر ہندستانی سے
مُراد وہ زبان ہی جو میرؔ، سوداؔ، غالبؔ اور آتشؔ و ناسخؔ

نے لکھی ہے اور جو پچاس برس پہلے یا اس کے بعد دہلی میں
بولی جاتی تھی اور لکھنؤ میں رائج ہے تو ہمیں اس کے ماننے
میں کوئی تامل نہیں۔ میری رائے میں صحیح اور فصیح اُردو
وہ ہے جو ڈاکٹر عبدالحق اپنے رسالہ 'اُردو' میں لکھتے
ہیں۔ وہ زبان جو دہلی اور لکھنؤ کے بازاروں میں بولی جاتی
ہے اور جس کا رواج تعلیم یافتہ طبقے میں ہو چکا ہے۔ اس میں
سینکڑوں عربی، فارسی نیز سنسکرت کے لفظ شامل ہیں۔ عوام
کو اس کا علم بھی نہیں کہ وہ عربی فارسی کے ہیں یا سنسکرت
کے۔ اس لیے اب وہ غیر زبان کے لفظ نہیں رہے
بلکہ اُردو کے ہو گئے ہیں۔ کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی کہ
یہ الفاظ جو مدت دراز کے استعمال سے اُردو میں جذب
ہو گئے ہیں اور اس کا جز بن گئے ہیں زبان سے

خارج کر دیے جائیں۔ اور ان کی بجائے ایسے لفظ داخل کیے جائیں جو سراسر غیر مانوس ہیں۔ البتہ یہ میں ضرور کہتا ہوں کہ عربی، فارسی، سنسکرت کے ثقیل اور غیر مانوس الفاظ اُردو زبان میں بلا وجہ نہ ٹھونسے جائیں۔ اس سے زبان کی فصاحت میں فرق آتا ہے۔

مجھے اس موقع پر اپنی الہ آباد کی ایک تقریر کے الفاظ دہرانے پڑتے ہیں "اُردو زبان ہندو مسلمانوں کا ایک ایسا مشترکہ و مقدس ترکہ ہے جو قطعاً ناقابل تقسیم ہے"۔ اس لیے مسلمان اگر یہ دعویٰ کریں کہ یہ اُن کی زبان ہے تو یہ دعویٰ ہرگز قابل قبول نہیں۔ یہ ایک مشترکہ ترکہ ہے جو صدیوں سے ہمارے حصّے میں آیا ہے۔ یہ ہماری تہذیب کا خزانہ ہے۔ بحیثیت ہندو ہونے کے مجھے یہ کہنے میں کچھ تامّل

نہیں کہ میری مادری زبان اُردو ہے۔ اور ہندستانی کا کیا مطلب ہے؟ میں ڈاکٹر عبدالحق سے پھر سوال کرتا ہوں کہ وہ مجھے اس کا مطلب سمجھائیں۔ یہی زبان جسے ہم اُردو کہتے ہیں تنہا وسیلہ ہے جس سے ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کی تہذیب کو سمجھ سکتے ہیں۔ یہی وہ ذریعہ ہے جس سے ہندو مسلمانوں میں اتحاد پیدا کیا جا سکتا ہے۔ میرے خیال میں اس سے بڑھ کر کوئی غلطی نہیں ہو سکتی کہ اس زبان کو مٹانے اور اس رشتہ کو توڑنے کی کوشش کی جائے۔

کشمیر میں شعر و سخن کا ذوق ایک زمانے سے چلا آرہا ہے۔ کشمیر نے بڑے بڑے اعلیٰ پایہ کے شاعر پیدا کیے ہیں جن میں غنی کشمیری ایک ممتاز اور شاندار مثال ہے۔ ایک بار میں کیمبرج میں پروفیسر براؤن کا جو فارسی

کے بہت بڑے فاضل تھے، مہمان تھا۔ ان کی صحبت
ادبی اور علمی لحاظ سے بہت پُرلطف ہوتی تھی۔ ایک
مرتبہ باتوں باتوں میں میں نے اُن سے دریافت کیا
کہ ہندستان کے فارسی شعرا میں سے کس کا کلام مقبول
ہوا اور اہل ایران ہمارے کن شاعروں کو شاعر مانتے
ہیں۔ انھوں نے فرمایا ایک تو خسرؔو کو اور دوسرے
غنؔی کشمیری کو۔ اس لیے اگر کشمیر میں شعر و سخن کا چرچا
نہ ہو تو کہاں ہو سکتا ہے؟ کوئی شخص خواہ کتنا ہی خشک
کیوں نہ ہو۔ اگر وہ نشاط باغ، شالامار یا چشمۂ شاہی
میں (جہاں میں دو مہینے سے مقیم ہوں) جائے اور
وہاں کی سیر کرے تو ممکن نہیں کہ اس کے دل میں شعر
سننے یا شعر گوئی کا جذبہ پیدا نہ ہو۔ ہندستان میں اگر

کوئی مقام ایسا ہی جو شعرا کے لیے القا اور الہام کا حکم رکھتا ہی تو وہ کشمیر ہی ہی۔

مجھے یہ سن کر بڑی مسرت ہوئی کہ بہت سے اعلیٰ پایہ کے شعرا اس مجلس میں تشریف لائے ہیں۔ جن کا کلام سن کر آپ محظوظ ہوں گے۔ میں جانتا ہوں کہ آپ شعرا کا کلام سننے آئے ہیں۔ میری تقریر سننے نہیں آئے ہیں۔ لہذا میں اپنی تقریر کو طول دینا نہیں چاہتا اور آپ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جلسے کی کارروائی شروع کرتا ہوں۔

(۷۶)
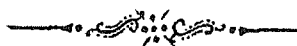
پیام بموقع کل ہند اردو کانفرنس

دہلی (دسمبر ۱۹۳۹ء)

۱۹-البرٹ روڈ-الہ آباد ۲۶ دسمبر ۱۹۳۹ء

مخدومی و مکرمی ڈاکٹر عبدالحق صاحب

تسلیم و نیاز - اگرچہ میری بڑی خواہش تھی کہ میں اس موقع پر جلسے میں شریک ہوں لیکن پچھلے تین چار روز سے میری طبیعت پھر ناساز ہوگئی ہے اور مجھے خوف ہے کہ ریل کے سفر سے زیادہ خراب نہ ہو جائے - لہذا بحالت مجبوری میں حاضر نہیں ہو سکتا - کل شب کو ڈاکٹر صدیقی صاحب بھی تشریف لائے تھے میں نے اُن

سے زبانی بھی عرض کر دیا ہو کہ میری طرف سے معذرت کر دیں۔

اگرچہ میں جلسہ میں موجود نہ ہوں گا لیکن میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں آپ کے مقاصد اور اغراض سے بہمہ وجوہ وابستہ ہوں اور پوری ہمدردی رکھتا ہوں۔ آپ کا ہم نوا اور ہم آہنگ ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آپ اپنے مقاصد میں پورے طور پر کامیاب ہوں گے۔ میں اس مسئلہ زبان کو کسی فرقہ وارانہ نگاہ سے نہیں دیکھنا چاہتا ہوں۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ جو تنازعہ اس وقت زبان کے مسئلہ کے متعلق ہندستان میں پیدا ہو گیا ہو اس کی اہمیت اور تنازعات سے بہت زیادہ ہو۔ کیونکہ اگر یہ زبان جس کے پیدا کرنے اور پرورش کرنے میں ہندو

اور مسلمان دونوں نے حصّہ لیا ہو تباہ ہوگئی
تو وہ تہذیب اور طرز زندگی بھی جس کا یہ ظاہری لباس ہو
تباہ ہو جائے گی اور کم از کم شمالی ہندستان میں تو ہم کو
بڑی مشکلات کا سامنا کرنا ہوگا۔ ایک مورّخ نے راجہ
ٹوڈرمل کے بارے میں یہ لکھا ہو کہ انھیں کے حکم سے
حسابات سلطنت فارسی میں لکھے جانے لگے اور ہندؤں
نے عام طور پہ فارسی کا پڑھنا شروع کیا جس کا آخر کار نتیجہ
یہ ہوا کہ شمالی ہندستان میں ایک نئی زبان یعنی اُردو
پیدا ہوئی جس کو اگر ہندو قبول نہیں کرتے تو ہرگز پیدا
نہیں ہوسکتی تھی۔ یہ تو ظاہر ہو کہ یہ غیر ممکن تھا کہ تمام ہندو
فارسی پڑھ جاتے اور یہ بھی اسی قدر غیر ممکن تھا کہ اس
زمانے میں تمام مسلمان ہندی پڑھ جاتے۔ چونکہ دونوں کو

اسی ملک میں رہنا تھا اور ایک دوسرے کے ساتھ دنیا
کے کاروبار لازمی تھے لہذا ضروریات وقت نے دونوں
کو اس پر مجبور کیا کہ ایسی زبان مشترکہ پیدا کی جائے کہ ایک
دوسرے کے خیالات کو سمجھ سکیں اور ایک دوسرے کی
وقعت اور احترام کر سکیں یہی وجہ ہے کہ اُردو میں ہندی،
سنسکرت، فارسی، عربی اور دیگر زبانوں کے الفاظ کی
اس قدر آمیزش ہے۔ رفتہ رفتہ اسی زبان کے اُستادوں نے
اس زبان کو اس خوبی کے ساتھ مانجھا کہ اس کو بذاتِ خود
ایک مشترکہ زبان ہونے کا وقار حاصل ہو گیا۔ اور اس کو
مشترکہ زبان کہنے میں نہ ہندو اور نہ مسلمان اپنی بےعزتی
سمجھتے تھے۔ اسی وجہ سے ہمارے ملک میں ایک مشترکہ
تہذیب پیدا ہو گئی جس کی وجہ سے کم از کم شہروں میں تو

تبادلۂ خیالات میں کسی قسم کی دقّت محسوس نہیں ہوتی تھی
بلکہ واقعہ یہ ہی کہ دہلی۔ آگرہ۔ روہلکھنڈ اور پنجاب کے اطراف
میں تو اس زبان کو دیہات میں بھی دخل ہو گیا اور دیہاتی
زبان میں بھی ہزارہا الفاظ داخل ہو گئے جن کو ہم یہی
سمجھتے تھے کہ ہمارے ملک کے الفاظ ہیں۔ مگر اب دھارا
دوسری طرف بہہ رہا ہی اور اب یہ کوشش کی جا رہی ہی
کہ چُن چُن کر وہ الفاظ جو مقبول عام ہو گئے ہیں ہماری
زبان سے خارج کیے جائیں اور ایک نئی زبان پیدا
کی جائے جو کہ تمام ملک پر حاوی ہو۔ میں آپ سے صحیح
عرض کرتا ہوں کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کوشش
کیوں اس وقت کی جا رہی ہی۔ ایسی کون سی ضرورت
لاحق ہوئی ہی کہ جس کی وجہ سے ہم اس زبان کو جو کہ

وہ دو سو ڈھائی سو برس سے شمالی ہندستان میں رائج ہو گئی
ہے اس طریقہ سے ختم کریں اور اس زبان کے ساتھ اس
تہذیب کو بھی ختم کریں جس میں کہ یگانگت کے خیالات
پیدا کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ میں ہرگز یہ نہیں چاہتا
کہ حامیانِ اُردو، ہندی یا کسی اور زبان پر حملہ کریں مگر
میں یہ ضرور چاہتا ہوں کہ اور لوگ بھی اُردو پر حملہ نہ
کریں۔ اُردو اس وقت میرے خیال میں معرض خطر میں
ہے اور اس وقت خطرہ زیادہ اس وجہ سے ہے کہ آپس
کی جنگ و جدل کی وجہ سے ہندو بھی اس کو بگاڑ رہے
ہیں اور مسلمان بھی۔ اگر ہندوؤں کی طرف سے یہ کوشش
ہوتی ہے کہ معمولی الفاظ فارسی یا عربی کے جو ہماری
زبان میں جذب ہو گئے ہیں نکال دیے جائیں تو

مسلمانوں کی طرف سے یہ کوشش ہوتی ہو کہ بجائے
ہندی کے معمولی الفاظ کے مشکل سے مشکل الفاظ
عربی یا فارسی کے جو عام فہم نہیں ہیں، استعمال کیے
جائیں۔ اُردو کے ساتھ اس سے زیادہ کوئی بُرا سلوک
نہیں ہوسکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اب وقت آگیا ہو کہ انجمن
ترقیٔ اُردو اس معاملہ میں پیش قدمی کرے اور ایک معیار
زبان کا قائم کرکے اس بات پر اصرار کرے کہ جو کتابیں
یا مُراسلے یا اخبارات اُردو میں لکھے جائیں وہ اسی
زبان میں ہوں جو کہ عام فہم ہو تاکہ اس زبان کی
روز افزوں ترقی ہو اور اس کو وسعت حاصل ہو۔ یہ
ضرور ہی کہ اصطلاحی الفاظ کا ذخیرہ ہمارے یہاں کافی
نہیں ہی اور ہم کو دیگر زبانوں سے جس میں کہ میں انگریزی

کو بھی شامل کرتا ہوں، ایسے الفاظ لینے پڑیں گے۔ ادب
کا دائرہ اب نہایت وسیع ہوتا چلا جاتا ہے۔ میرے خیال
میں ہماری انجمن کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ ایسی کتابیں مستند
اردو زبان میں شایع کرے کہ جس کی بدولت ہمارے
نوجوانوں کی تعلیم شروع سے آخر تک کافی طور پر ہو جاوے
مثلاً ہندستان کی تاریخ۔ میں کوئی وجہ نہیں دیکھتا کہ
ہمارے ادیب ہر حصہ تاریخ ہندستان کے اوپر ہندو
زمانے سے لے کر انگریزی زمانے تک عالمانہ کتاب
نہ لکھیں۔ ادب میں تنگ نظری و تعصب کی گنجائش
نہیں ہے۔ ادب کو کسی ذاتی اعتقاد یا تعصب سے تعلق
نہیں ہے۔ وہ ادیب ادیب نہیں جس میں منصف مزاجی
نہ ہو۔ لہذا میں نہایت ادب کے ساتھ عرض کروں گا

کہ انجمن ترقی اُردو کا فرض ہو کہ وہ اس معاملہ میں ہماری رہنمائی کرے۔ اور جس انجمن کا روح رواں ایسا شخص ہو جیسا کہ ڈاکٹر عبدالحق۔ اُس سے ایسی امید کرنا ہمارے لیے بیجا نہ ہوگا۔ آخر میں دُعا کرتا ہوں کہ آپ کا جلسہ کامیاب ہو اور آپ ایسی تجاویز منظور فرمائیں کہ جو عملی طور پر مفید ثابت ہوں۔

نیاز مند

تیج بہادر سپرو

(۸۵)
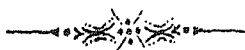
اہلِ کشمیر سے سرسپرو کا خطاب

[سری پرتاب کالج، سری نگر (کشمیر) کے جلسہ تقسیم اسناد ۱۹۴۰ء کی صدارت، رائٹ آنریبل ڈاکٹر سرتیج بہادر سپرو پی سی، کے سی۔ ایس۔ آئی، ایم اے، ایل۔ ایل۔ ڈی (الہ آباد) ڈی۔ سی۔ ال (آکسفورڈ) ڈی۔ لٹ (بنارس) ال۔ ال۔ ڈی (عثمانیہ) نے فرمائی تھی۔ ہم خطبۂ صدارت کا وہ اقتباس پیش کرتے ہیں جو تہذیب و تمدن اور زبان سے متعلق ہے۔]

کشمیر ہمیشہ ہمیشہ سے دوسرے ملک والوں کے لیے بہت ہی دل کش اور دل فریب خطّہ رہا ہے لیکن شاید کم لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ ان بیش بہا تحائف کے علاوہ

جو قدرت نے اس ملک کو برف پوش پہاڑیوں، خوش
خرام ندیوں، خاموش جھیلوں، پرشکوہ باغوں، مخملیں
سبزہ زاروں اور لذیذ میووں کی شکل میں بڑی فیاضی
سے کام لے کر عطا کیے ہیں، کشمیریوں نے ہندوؤں
کے عہد میں بھی اور مسلمانوں کے عہد میں بھی ہندستانی
تہذیب اور فلسفہ کی ترقی میں اتنا حصّہ لیا ہو کہ اس پہ
ان کی موجودہ نسلیں جتنا بھی فخر کریں کم ہو۔ تہذیب و تمدن
کا ذکر کرتے وقت یہ تذکرہ بہت ضروری معلوم ہوتا ہو
کہ ان تمام انقلابات اور کشمکش کے باوجود جن سے
کشمیر کی تاریخ بھری پڑی ہو، ایک بات سب سے
زیادہ نمایاں ہو اور وہ یہ کہ ہندستان کے تمام دوسرے
حصّوں سے زیادہ کشمیر حقیقی معنوں میں ہندوؤں اور

مسلمانوں کی تہذیب کا سنگم بنا رہا۔

گزشتہ زمانے میں کشمیری مسلمانوں نے فلسفہ شاعری اور آرٹ کے میدانوں میں جو جوہر دکھائے اُن سے کون واقف نہیں۔ کاش ان بزرگوں کی اولاد میں کوئی ایسا بھی ہوتا جو ان کارناموں کی مسلسل اور صحیح تاریخ دُنیا کے سامنے پیش کر سکتا۔ یہ شرف ایک انگریز اہلِ قلم کو ہی ملنا تھا کہ اس نے شاہ ہمدان کے فلسفے سے دنیا کو کسی قدر روشناس کرایا۔ مگر ہم کو بھولنا نہ چاہیے کہ شیخ نورالدین کی شاعری اور اس کا فلسفہ کشمیر کے ہندوؤں اور مسلمانوں کا مشترکہ ورثہ ہے۔ کوئی بیس برس ہوئے کہ میں کیمبرج میں پروفیسر ایڈورڈ براؤن سے ملا تھا۔ جن کی فارسی دانی مسلّم ہے۔ ان کی زبان

سے یہ سُن کر مجھے بڑا فخر محسوس ہُوا کہ فارسی کے ان
چند ہندستانی شاعروں میں جن کی شہرت و مقبولیت
ایران تک پہنچی ہو غنیؔ کشمیری بھی ہو۔ مغلوں کے بنائے
ہوئے شاہی باغ، جسے دیکھنے کے لیے آج بھی ہزاروں
آدمی باہر سے آتے ہیں اس کا شاہد ہو کہ جہانگیر کو کشمیر
سے کتنی الفت تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر بڑی مسرت ہوئی
کہ مہاراجہ بہادر کی حکومت ان باغوں کی دیکھ بھال
بڑے اہتمام سے کرتی ہو ـــــ آرٹ کے میدان میں
بھی ہندستان بھر میں کشمیر کا درجہ سب سے بلند ہو۔
اپنے زمانے پر نظر ڈالتے ہوئے ہمیں یاد آتا ہو کہ اُس
فلسفی شاعر کے آباؤ اجداد بھی جو حال ہی میں ہم سے
جدا ہوُا، کشمیر ہی کے رہنے والے تھے۔ میری مُراد

مرحوم سر محمد اقبال سے ہے۔

اب میں کچھ خاص کر نوجوان پنڈتوں سے کہنا چاہتا ہوں۔ اس تخصیص کی وجہ میری یہ آرزو ہے کہ ان نوجوانوں کے دلوں میں یہ ذہن نشین ہو جائے کہ ان کے آباؤ اجداد اور ان کے ہمعصر جو ہندستان بھر میں پھیلے ہوئے ہیں، اس مشترکہ تہذیب کے کس درجہ مرہون منت ہیں۔ کتنے بڑے افسوس کی بات ہوگی اگر اس زمانے میں جبکہ ہندو مسلمانوں میں اتفاق پیدا کرنے والی باتیں کم اور نفاق بڑھانے والی باتیں زیادہ ہوگئی ہیں ــــــ اسے بھلا دیا جائے کہ اُن بزرگوں نے اس مشترکہ تہذیب سے دامن بچانے کا کبھی خیال تک نہیں کیا۔ کشمیر سے جو شخص ذرا بھی

واقف ہو وہ کشمیری پنڈتوں کی ان کوششوں کو نظر انداز
نہیں کرسکتا جو انھوں نے فلسفہ، شاعری اور تمدّن کو
ترقی دینے میں کیں۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ کشمیر نے
کم سے کم دو خواتین ایسی پیدا کی ہیں جن کی شاعری
اور جن کا فلسفہ اب بھی ہمارے لیے دلآویز اور باعثِ فخر
ہوسکتا ہے ___ یہ بالکل دُرست ہے کہ ہندوؤں نے اپنا
فلسفہ اور اپنا تمدّن محفوظ رکھا لیکن ساتھ ہی یہ بھی
واقعہ ہے کہ انھوں نے نوواردوں اور دوسرے مذہب
کے پیروؤں کے تمدن کو نظر انداز نہ کیا۔ یہ کسے نہیں
معلوم کہ شمالی ہندستان میں یہ کشمیری پنڈت ہی تھے
جنھوں نے اپنے اندر ہندوؤں اور مسلمانوں کی بہترین
چیزیں یکجا کرلیں۔ یہ کشمیری پنڈتوں کی فارسی دانی

ہی کا طفیل تھا کہ انھیں مغل درباروں میں امرا کے منصب ملے۔ میرے اس قول کی تصدیق ان بزرگوں کے سوانح حیات سے ہوتی ہے جو حالات سے مجبور ہو کر کشمیر سے ہجرت کر کے ملک کے اس حصّے میں چلے گئے جو اب برطانوی ہندستان کہلاتا ہے۔ یہ ایک وسیع تر دنیا میں مقابلے کے لیے نکلے تھے۔ ایک مضبوط کردار، ذہانت اور موقعہ شناسی کی زبردست صلاحیت ان کے ہمرکاب تھی اور جب تک دہلی اور لکھنؤ کی درباری زبان فارسی رہی انھوں نے کائستھوں کی طرح بڑے بڑے سرکاری عہدے حاصل کیے۔ لیکن کشمیری پنڈتوں کی شہرت صرف اسی وجہ سے نہیں ہے کہ انھوں نے دہلی، لاہور اور لکھنؤ میں بڑے بڑے عہدے سنبھالے ہیں بلکہ زورِ قلم اور

علم مجلس کے اعتبار سے بھی کشمیری پنڈتوں نے نام
پیدا کیا اور مسلمان حکمرانوں نے بھی اسے تسلیم کیا۔ جب
فارسی کی جگہ اُردو نے لی، تب بھی کشمیری پنڈت بہت
جلد نئی فضا میں نمایاں ہو گئے۔ اگر وقت اجازت
دے تو میں ان بہت سے کشمیری پنڈتوں کے نام
گناؤں جو فارسی اور اُردو اہل قلم کی حیثیت سے برطانوی
ہند میں سر بلند رہے ہیں۔ عہد مغلیہ کے رائے رایاں
انند رام مخلص کے تعارف کی ضرورت نہیں جنھوں
نے نہ صرف اعلیٰ مراتب حاصل کیے بلکہ خاندان مغلیہ
کی ایک گراں مایہ تاریخ لکھی ہے۔ گلزار نسیم کے زندۂ جاوید
مصنف پنڈت دیا شنکر نسیم کا نام کس نے نہ سنا ہو گا۔
ہندستان میں شاید ایک شخص بھی ایسا نہ ہو جو میرے

مرحوم دوست پنڈت برج نرائن چکبست کی شاعری کا معترف نہ ہو، اور اس سے کون انکار کرسکتا ہو کہ اُردو ناول کے موجدوں میں ایک نام رتن ناتھ درسرشار کا بھی ہو۔ جو کشمیری پنڈت تھے۔ ایسی ہی ہزاروں مثالیں ہیں۔ مدبرین اور سیاحوں کی فہرست میں پنڈت (بعد کو مرزا) موہن لال کا نام خاص طور پر آتا ہو۔ ججوں میں پنڈت شمبھو ناتھ تھے جو پہلے ہندستانی ہیں جن کو کلکتہ ہائی کورٹ کا جج مقرر کیا گیا۔ وکیلوں اور لیڈروں میں پنڈت اجودھیا ناتھ، پنڈت شمبھو ناتھ (آنجہانی) پنڈت بشن نرائن در آنجہانی، پنڈت پرتھی ناتھ چاک آنجہانی، جگت نرائن مُلّا، شیو نرائن شمیم، اور سب سے آخر میں لیکن کسی سے کم نہیں پنڈت موتی لال نہرو آنجہانی کے نام کافی مشہور ہیں، اور بہت سے

رنجیت سنگھ کی سلطنت میں اور موجودہ ریاستوں کے
نظم مملکت میں نام پیدا کر چکے ہیں ـــــ کشمیر کے نوجوان
پنڈتوں کے سامنے میں فی الحقیقت اس سے بہتر مثالیں
پیش نہیں کرسکتا لیکن یہ امید رکھتا ہوں اور اس کے لیے
دست بدعا ہوں کہ ان مثالوں کو آپ نوجوان نہ صرف
ذاتی مقاصد کے حصول میں پیش نظر رکھیں بلکہ ان کی
بدولت ملک و وطن کی خدمت کا جذبہ پیدا کرسکیں۔
اب میں ایک ذاتی استدعا آپ لوگوں سے کرتا ہوں
کہ ہندو ہونے کی حیثیت سے آپ نہ اپنے فلسفے کو
نظر انداز کیجیے اور نہ تہذیب و تمدن کے اس گرانبہا
خزانے کو جو آپ کو ورثے میں ملا ہو لیکن فارسی اور
اردو سیکھنے کا سلسلہ بھی جاری رکھیے۔ یہ اب بھی کشمیر

میں آپ کے بہت کام آئے گا خواہ آپ علم اور تمدن
کو افادی نقطۂ نظر ہی سے دیکھیں۔ اور یہ میرے لیے بڑے
افسوس کا باعث ہوگا اگر محض فرقہ وارانہ ذہنیت کی بدولت
آپ نے اپنے اجداد کی مثالیں پس پشت ڈال دیں،
اور اردو کو بدیسی زبان سمجھنے لگے۔ یقین مانیے تمدنی بندھن
سیاسی اتحاد کی بہ نسبت کہیں زیادہ مضبوط ہوتے ہیں
اور یہ بڑی افسوس ناک بات ہوگی اگر ہندی کو ترقی دینے
کی جائز خواہش کے ساتھ آپ نے اپنے پر یہ لازم کرلیا
کہ اردو کے ساتھ بے وفائی کی جائے جو ہندوؤں
اور مسلمانوں کو متحد کرنے کی سب سے مضبوط کڑی ہے۔